منشی سکھدیو پرشاد سنہا بسمل الہ آبادی

دل میں طرح طرح کی تمنا لئے ہوئے
بیٹھا ہوں ذوق و شوق کی دنیا لئے ہوئے

جذباتِ بسملؔ

از

منشی سکھدیو پرشاد سنہا بسملؔ الہ آبادی، شاگردِ ناخدائے سخن حضرت نوحؔ ناروی

مقدّمہ

از

آنریبل جسٹس سر عبدالقادر، جج ہائی کورٹ، لاہور

مرتّبہ

منشی کنھیّالال، ایم۔ اے؛ ایل ایل۔ بی؛ ایڈوکیٹ

ایڈیٹر "چاند" (اردو) الہ آباد، و رکن ادارت "ادبی دنیا" لاہور

انڈین پریس لمیٹڈ

الہ آباد

۱۹۳۲ء

(مولانا صفی لکھنوی)

کلامِ منتخب جذباتِ بسمل

مُصفّا جوہرِ آئینۂ دل

(ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی)

جو تڑپائیں جگر کو چُٹکیاں لینے لگیں دل میں

بھرے ہیں وہ اثر جذبات کے جذباتِ بسمل میں

(جناب شہیر مچھلی شہری مرحوم)

گلوں میں ہیں نہ یہ دل چسپیاں صوتِ عنادل میں

بھرے جذباتِ حُسن و عشق کے جذباتِ بسمل میں

(مولانا عزیز لکھنوی)

خہے دیوان رنگیں گُل بہ دامن

زہے جذباتِ بسمل سیرِ گُلشن

۱۹۳۰ء

منشی بشیشر دیال صاحب

قبلہ محترم

میں اپنے ناچیز کلام کے مجموعہ موسومہ "جذباتِ بسمل"
کو دست بستہ بہ صد ادب خدمتِ عالی میں نذر کرکے اُمید رکھتا ہوں
کہ آپ لطف اندوز ہوں گے اور میری محنت کی داد دیتے ہوئے
دُعا دیں گے کہ میرا کلام قبولیتِ عام حاصل کرے۔

جو نہ مُرجھائیں کبھی وہ اس چمن کے پھول ہیں
آپ کے پیشِ نظر باغِ سخن کے پھول ہیں

سُکھ نواس
یمنی پور الہ آباد وجے دشمی ۱۹۳۱ء

آپ کا فرمانبردار فرزند
سُکھدیو پرشاد سنہا بسمل
الہ آبادی

فہرست مضامین

تصاویر

مقدمہ

از آنریبل جسٹس سر عبدالقادر، جج ہائیکورٹ

لاہور

دو سال ہوئے لاہور میں ہندوستان کے ماہرانِ علوم مشرقی کا ایک بڑا مجمع ہوا اُس میں بہت سے عالمانہ مضامین پڑھے گئے، بہت سی دلچسپ تقریریں ہوئیں مگر ایک پُرلطف صحبت اہل لاہور کو کبھی نہ بھولے گی جو اس کانفرنس کے سلسلہ میں بہ صورت مشاعرہ اُردو منعقد ہوئی تھی۔ مشاعرہ کوئی آٹھ بجے شروع ہوا اور گیارہ بجے کے قریب برخاست ہونے کو تھا کہ میں نے دیکھا دو تین نَو وارد اصحاب تشریف لا رہے ہیں اُن میں سے ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ الہ آباد کے مشہور شاعر بسملؔ صاحب اُن کے ہمراہ ہیں اور اگر اُن سے کہا جائے تو وہ اپنے کلام سے حاضرین کو مستفید فرمائیں گے۔ چنانچہ اُن سے درخواست کی گئی اور اُنھوں نے پڑھنا شروع کیا مگر کیسا پڑھنا جس میں شاعرانہ ترنم اور تاثیر، ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ پہلا شعر پڑھتے ہی بسملؔ صاحب مجمع پر چھاگئے، جب تک پڑھتے رہے سُننے والوں پر ایک خاص کیفیت و سکون و سکوت طاری رہی، گو کبھی کبھی پُرجوش تحسین کی تالیاں اُس سکوت کو توڑتی تھیں۔ اور جب وہ پڑھ چکے تو لوگوں نے اُنھیں گھیر لیا اور داد دینی شروع کی میں نے بھی چند جملے اُن کے کلام کی تعریف میں کہے یہ میری اور اُن کی پہلی ملاقات تھی۔ اُسکے بعد مِلنے کا موقعہ ابھی نہیں ملا شاید بعض حضرات کو تعجّب ہوگا کہ اس تعارف میں اُن کے کلام کے مجموعے کا دیباچہ لکھنے کا کیسے مستحق ہوگیا۔ میں اس کا جواب نہیں دے سکتا اس کا جواب حضرت بسملؔ سے پوچھئے مجھے تو اسی قدر معلوم ہے کہ میرے دل پر اُس ایک سرسری ملاقات نے گہرا نقش چھوڑا لیکن مجھے بہت خوشی ہوئی جب یہ پتا چلا کہ اُس نقش کا عکس جناب بسملؔ کے

آنریبل جسٹس سر عبدالقادر جج ہائی کورٹ (لاہور)

آئینۂ دل پر بھی رہ گیا اور اُنھوں نے کچھ عرصہ ہوا مجھے یہ خط لکھا کہ وہ اپنا کلام شائع کرنے کو ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ میں اُس کے شروع میں چند سطریں لکھ دوں۔ اُنھوں نے اپنا قلمی مسودہ میرے پاس بھیجا ہے جسے میں نے نہایت شوق سے پڑھا ہے۔کتاب کا نام "جذبات بسملؔ" بہت موزوں ہے کیونکہ جذبات ہی مصنّف کے کلام کا بہترین امتیاز ہیں۔ زبان کی سادگی اور سلاست اُن کے کلام کی دوسری خصوصیت ہے اور کیوں نہ ہو فنِ شعر میں آپ ناخدائے سخن حضرت نوحؔ ناروی کے شاگرد ہیں جو فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی مرحوم کے بلند پایہ تلامذہ میں ہیں۔

جناب بسملؔ کے حالات زندگی اکثر رسالوں اور اخبارات میں چھپ چکے ہیں اس لئے اس بارے میں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں آپ کا خاندانی نام "منشی سکھ دیو پرشاد سنہا" ہے آپ فطرت سے شاعرانہ طبعیت لیکر آئے ہیں اور اسی لئے اُنھوں نے نسبتاً آغاز عمر میں شاعری میں نام پیدا کرلیا۔ اس وقت آپ کا سن اکتیس برس سے کچھ اوپر ہے کیونکہ ۱۱ نومبر ۱۸۹۹ء آپ کی تاریخ ولادت ہے۔آپ کایستھوں کے ایک ذی علم اور معزز خاندان کے رُکن ہیں آپ کے چچا "منشی اننت لال صاحب" وکیل مرحوم نے اپنے بھتیجے کا میلان شاعری کی طرف دیکھ کر یہ مشورہ دیا کہ وہ "حضرت نوحؔ ناروی" سے اصلاح سخن لیں ۲۵ دسمبر ۱۹۱۸ء سے اُنھوں نے ایسے اُستاد سے فیض حاصل کرنا شروع کیا۔ ذوقِ سلیم پر باکمال اُستاد کی توجہّ سونے پر سہاگہ ہوگئی اور چند سالوں میں قبولیّت عام نے جناب بسملؔ کی کامیابی پر اپنی مُہر ثبت کردی۔ آپ ہر وقت نظم اُردو کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ آجکل جتنے اچھّے اُردو رسالے چھپتے ہیں وقتاً فوقتاً بسملؔ صاحب کے کلام سے مُزیّن ہوتے ہیں اور ہندوستان کے ہر حصّہ میں جہاں کہیں کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا ہے وہاں حضرت بسملؔ کو دعوت دی جاتی ہے۔

بسملؔ صاحب کا انداز کلام تو خود "جذبات" کے پڑھنے سے معلوم ہوگا لیکن چند شعر یہاں نمونے کے طور پر درج کرنے ضروری ہیں بجائے اس کے کہ میں کوئی اور شعر انتخاب

کروں بہتر ہوگا کہ جو اشعار میں نے لاہور کے قابل یادگار جلسے میں خود مصنّف کی زبان سے سنے تھے اور جن کی صدا اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے یہاں نقل کردوں سب سے پہلے جناب بسملؔ نے "فلسفۂ ہستی" کے متعلّق چند رباعیاں پڑھی تھیں جن میں سے ایک یہ ہے:۔

کرتا ہوں بیاں سُنئے بیانِ ہستی　　کچھ بھی نہیں کچھ بھی شانِ ہستی
اِس سانس کی بنیاد ہی کیا اے بسملؔ　　کندھے پہ ہوا کے ہے مکانِ ہستی

اس کے بعد اُنھوں نے تصوّف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ایک غزل پڑھی جس میں اُن کے پڑھنے کے طریق نے ایک خاص اثر پیدا کردیا تھا اُسکے چند شعر یہ ہیں :۔

مدّت سے یہ سنتے آتے ہیں وہ خانۂ دل میں رہتے ہیں
آجائیں نظر تو ہم جانیں کہنے کے لئے سب کہتے ہیں

دُنیا کے سمندر میں دیکھی تنکے کی طرح اپنی ہستی
ساحل پہ قدم رکھتے ہی نہیں ہر سمت یونہیں ہم بہتے ہیں

ہاتھوں کا اُٹھانا دُوبھر ہے لب ہم کو ہلانا مشکل ہے
آنکھوں کے اشارے ہی سے فقط اب حالِ مصیبت کہتے ہیں

مَیں سامنے لانے کی کوشش کرتا ہوں تو ناحق کرتا ہوں
وہ روزِ ازل سے پردے میں کچھ سوچ سمجھ کر رہتے ہیں

ہے نوحؔ سے نسبت بسملؔ کو طوفانِ سخن سے ڈر کیسا
ہر بزم میں غزلیں پڑھتے ہیں ہر بحر میں غزلیں کہتے ہیں

مندرجہ بالا غزل کا مقطع جب پڑھا جارہا تھا تو میرے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ ہماری مشرقی تربیت میں اُستاد و شاگرد کا رشتہ کیسا لاجواب رشتہ تھا جو باپ بیٹے سے ملتا جلتا تھا۔ اور جس کا پائدار اثر شاگرد کے صفحۂ دل پر رہتا تھا۔ دیکھئے اُستاد مسلمان ہے شاگرد ہندو ہے مگر غزل سے یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ نوحؔ کون ہے اور بسملؔ کون ہے۔ اگر ہندوستان میں کوئی چیز ہے جس کے احاطے میں ہندو اور مسلمان ایک ہوگئے تھے

تو وہ ہندوستانی زبان ہے جسے اُردو بھی کہتے ہیں اس کا ڈھانچہ ہندی سے بنا ہے اور ڈھانچہ کی پوشش فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ زبانوں کے رنگارنگ کپڑوں سے ہوئی ہے ہندو مسلمان دونو اس کے نشو ونما میں شریک رہے ہیں اور اب بھی ہیں اور اسی کے ذریعہ اگر وہ چاہیں تو ایک قوم بن سکتے ہیں۔

ایک اور غزل میں جناب بسملؔ اپنی وسعتِ خیال کو یوں بیان کرتے ہیں :-

مجھے ہے واسطہ دیر و حرم دونوں سے اے بسملؔ
کہ میں ہندو ہوں ہندو میں مسلماں ہوں مسلماں میں

یہی وہ رنگ ہے جس کی اس زمانے میں ضرورت ہے اوّل تو زبانِ اردو خود ہندو مسلمانوں کے گزشتہ ملاپ کی یادگار اور آئندہ کے اتّحاد کی ضامن ہے پھر جب اُردو کے شعرا اور مصنّفین یک جہتی کے خیالات پھیلائیں تو باہمی اتّحاد بہت مضبوط ہو سکتا ہے۔

حضرتِ بسملؔ فنِ غزل گوئی میں اگرچہ پُرانے اساتذہ کی پیروی کرتے ہیں لیکن آج کل کے حالات کے تقاضے سے کہیں چھپے ہوئے کہیں کھلے ہوئے اشارے سیاسی آزادی کے متعلّق بھی کر جاتے ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ ہو اس میں آزادی کی طرف کیسا پُر لطف اشارہ ہے۔

مانتا ہوں میں بھی یہ اہلِ چمن کا فلسفہ
مَوت ہے کنجِ قفس میں زندگی گلشن میں ہے

ایک دوسری جگہ یہی مضمون کیسے صاف اور معنی خیز الفاظ میں نظم ہوا ہے۔

یہ زباں بندی بھی اک بیداد ہے بیداد پر
مُہر ظالم نے لگا دی کیوں لبِ فریاد پر

خوبی یہ ہے کہ تغزّل کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے یعنی اگر کوئی حالاتِ موجودہ کی طرف اشارہ سمجھے تو روا ہے ورنہ معشوق سے عاشق کی باتیں ایشیائی شاعری کے مسلّم انداز میں ہو رہی ہیں۔ مثلاً

کیا کہا پھر تو کہو ہم کوئی شکوا نہ کریں
چُپ رہیں ظلم سہیں ظلم کا چرچا نہ کریں

کہیں کہیں آزادی کے گیت کھلے بندوں گاتے ہیں مگر پھر بھی رنگ تغزّل ملحوظ رہتا ہے ایک غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

خاک میں مل کر اگر مل جائے آزادی مجھے　　کچھ نہ ہو غم کچھ نہ ہو پروائے بربادی مجھے

اِس قسم کے اشعار گو اپنی اپنی جگہ پُرلطف ہیں مگر کلامِ بسمل کی خصوصیت وہ اشعار ہیں جن میں حُسن وعشق کی تصویر بے ساختہ پن سے کھینچی گئی ہے۔ یا جن میں ویدانت اور تصوّف کا رنگ غالب ہے ایسے اشعار معانی کی خوبی کے ساتھ صورت کے لحاظ سے بھی دل کش ہوتے ہیں اور عموماً ایسی شگفتہ بحروں میں لکھے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا انھیں بار بار پڑھتا رہتا ہے اور ان کے ترنم سے سُرور حاصل کرتا رہے مثال کے طور پر یہ دو تین شعر دیکھئے :۔

لاکھ چھپائیے تو کیا، چھپ سکے گا رازِ عشق　　بول اُٹھے گا خود بخود چھیڑے بغیر سازِ عشق

فیصلہ دیکھیں کیا کرے حشر میں کارسازِ عشق　　ایک طرف ہے نازِ حُسن ایک طرف نیازِ عشق

حُسن کی سب کرامتیں پیشِ نظر ہوں خود بخود　　کعبۂ دل میں ہم پڑھیں دل سے اگر نمازِ عشق

دو تین شعر اور پیش کئے جاتے ہیں جو پھولوں کے متعلق ہیں اور پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں :۔

گلزار میں آیا موسمِ گُل اللہ رے جوانی پھولوں کی　　اب پھول کے بُلبل کہتی ہے پھولوں سے کہانی پھولوں کی

گلشن میں نہ کیوں کر دل بہلے وہ سُنتے ہیں مَیں سُنتا ہوں　　پھولوں سے فسانہ بُلبل کا بُلبل سے کہانی پھولوں کی

بُلبل کے مقدّر سے بیشک تقدیر اسی کی اچھی ہے　　چل پھر کے صبا ہی چومتی ہے کیا کیا پیشانی پھولوں کی

"جذباتِ بسمل" میں غزلوں کے علاوہ کئی مسلسل نظمیں شامل ہیں جن میں سے بعض روحانی مضامین پر اور بعض قومی مضامین پر لکھی گئی ہیں۔ "کرشن کنھیا" کے جنم پر ایک دل کش نظم ہے جس کا صرف ایک بند نمونے کے طور پر یہاں درج کیا جاتا ہے ارباب ذوق پوری نظم پڑھیں :۔

کس قیامت کا بھرا سوز ترے ساز میں ہے　　رنگِ اُلفت بھی نہاں خوبیِ انداز میں ہے

یہ بڑے جوش میں ہے اور بڑے ناز میں ہے　　گویا جادو اِسی جادو بھری آواز میں ہے

راگ کے وقت کوئی دُھن میں کوئی لَے میں ہے مست
دیکھتا ہوں جسے اچھی طرح وہ نَے میں ہے مست

کرشن جی کی تعریف سے شاعر کو جمنا کی تعریف یاد آجاتی ہے اور وہ یوں اُس کی قدرتی خوبیوں کی مدح سرائی کرتا ہے ؎

سببِ فخر و شرف گوکل و متھرا کے لئے | باعثِ ناز ہے بے شبہ ہمالا کے لئے
مختصر یہ ہے بڑی چیز ہے دُنیا کے لئے | خاص اِک نعمتِ حق وادی و صحرا کے لئے

دل کی سربستہ کلی فرطِ خوشی سے کھل جائے
اُس کو امرت ملے جس کو ترا پانی مل جائے

قومی نظموں میں ایک نظم "شوقِ آزادی" کے عنوان سے لکھی ہے اِس کے ایک بند میں کس سادگی سے مگر زور کے ساتھ مطالبۂ وطن پیش کیا ہے :-

کہ ہر طریق سے آزاد ہو کے رہنا ہے | جو عہد کر چکے ہیں اُس کو صاف کہنا ہے
یہاں تو کھیل غرض ہر ستم کا سہنا ہے | نجات کے لئے زنجیر و طوق گہنا ہے

بلا سے کچھ نہ ملے غم نہیں چمن مل جائے
وطن کے ہم ہیں ہمارا ہمیں وطن مل جائے

قدرتی مناظر کی داد ایسے خوبصورت الفاظ میں دیتے ہیں کہ اُن مناظر کی رنگین تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ برسات کی شام کا بیان شعروں میں کیا ہے اُن میں سے چند ملاحظہ کیجئے ؎

اُس کی رنگینی میں کیا ہے دل فریبی دیکھئے | سر اُٹھا کر آسماں کی جامہ زیبی دیکھئے
جھانکتا پردے سے ہے شاید یہ مہ پارا کوئی | بزمِ گردوں پر ہُوا ہے انجمن آرا کوئی
آسماں پر کھل رہے ہیں پھول لاکھوں رنگ کے | مَیں نہ کیوں قربان جاؤں اس ادا اس ڈھنگ کے

اِس دلچسپ مجموعے کے اخیر میں کچھ متفرق اشعار ظریفانہ پیرائے میں اخلاقی، مُلکی، معاشرتی مضمونوں پر لکھے گئے ہیں جو حضرت اکبرؔ الہ آبادی مرحوم کے رنگ میں ہیں حضرت بسملؔ بھی الہ آباد کے ہیں اور حضرت اکبرؔ مرحوم بھی الہ آباد کے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ اکبرؔ کے خصوص رنگ کی مقبولیت بسملؔ کے دامنِ دل کو نہ کھینچتی۔ اس قسم کے چند

متفرق اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں جو کسی حاشیہ آرائی کے محتاج نہیں ہے

کہیں گھر کو نہ اپنے بھول جانا　　سمجھ کر سوچ کر اسکول جانا

مستقل ہو کر رہے صاحب بھلا کس کی طرف　　یہ کبھی اُس کی طرف ہیں یہ کبھی اِس کی طرف

اب زمانے میں آدمی بسمل
فیشن ایبل نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہندو بھی مسلماں بھی رستے سے بھٹک کر　　میدانِ ترقی کی سڑک کوٹ رہے ہیں

یہ ہیں اندھیرے میں رہتے ہیں وہ اُجالے میں
بس اتنا فرق ہے گورے میں اور کالے میں

اصنافِ سخن کی جو مختلف مثالیں پیش کی گئی ہیں اُن سے یہ معلوم ہو گیا کہ حضرتِ بسمل شہرِ سخن کے سب گلی کوچوں سے ہو نکلے ہیں اور ہر صنف میں خوب طبع آزمائی کر سکتے ہیں گو غزل اور وہ بھی سادہ غزل ان کا خاص میدان ہے میرے خیال میں سادگی ان کے کلام کا ایسا جوہر ہے جس کی جتنی تعریف کیجائے کم ہے۔ ایک جگہ خود فرماتے ہیں :-

سہل لکھ لکھ کر یہ کیا اچھا تماشا کر دیا
حضرتِ بسمل نے تو اُردو کو بھاشا کر دیا

واقعی اگر سادہ اور آسان اُردو لکھی جائے تو اُس میں اور بھاشا میں کیا فرق ہے؟ البتہ آج کل کی بھاشا جو سنسکرت الفاظ سے لدی ہوتی ہے اور اُردو جو عربی اور فارسی الفاظ سے پُر ہوتی ہے یہ دونوں ایک دوسرے سے پرے ہوتی جاتی ہیں، اس خلیج کو پُر کرنا حضرتِ بسمل کے مقاصدِ زندگی میں شامل ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیں۔ یہ مفید مقصد اس مجموعے میں پیش نظر رکھا گیا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اس خاص مقصد کو سامنے رکھکر اشعار لکھے گئے ہیں کیونکہ پھر اُن اشعار میں روانی نہ ہوتی جو بسمل کے کلام کی خصوصیت ہے میرا مطلب فقط یہ ہے کہ حضرتِ بسمل

نے طبیعت پائی ہے صلح پسند اور اُس پر ناخدائے سخن حضرتِ نوحؔ کے اثر سے اُن کی علمی تربیت ایسی ہوئی ہے کہ صُلحِ کُل خیالات اُن کی طبیعت کے جزو بن گئے ہیں اور اُن کے بربط سے آواز بھی یہی نکلتی ہے کہ دیر و حرم ایک ہیں۔ سب کا معبودِ حقیقی ایک ہے اور اُسکے سب بندوں کو آپس میں محبّت رکھنی چاہیئے۔

مَیں امید کرتا ہوں کہ اس مجموعے کی اشاعت مقبول ہوگی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی مشترکہ زبان اور اس کے بیش بہا ادبی خزانوں کا سچّا قدردان بنادیگی اور اُردو داں جماعت کا ہر طبقہ "جذباتِ بسملؔ" کو شوق سے خریدے اور پڑھے گا۔

حضرتِ بسمل الہ آبادی

منشی سکھ دیو پرشاد سنہا بسملؔ الہ آبادی کے والد کا نام منشی بشیشر دیال صاحب ہے۔ یہ الہ آباد کے ایک معزز کایستھ ہیں۔ ان کا پرانا وطن موضع بھوانی پور ضلع رائے بریلی ہے۔ ستّر انتّی سال ہوئے ہوں گے کہ ان کے بزرگوار الہ آباد تشریف لائے اور یہیں اپنی مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ماڈرن ہائی اسکول اور کایستھ پاٹ شالہ کالج میں ہوئی۔ شعر و سخن سے شروع ہی سے شوق تھا۔ اپنے چچا منشی اننت لال صاحب وکیل مرحوم کے حکم سے ۲۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو قبلہ استادی ناخدائے سخن حضرت نوحؔ ناروی کے دولت خانے پر پہنچے اور وہیں باضابطہ شاگرد ہوئے۔ حضرت نوحؔ کی بھی ان پر خاص نظرِ شفقت رہتی ہے اور یہ بھی اُن کے بڑے عقیدت مند ہیں۔

حضرت بسملؔ کا کلام "جذباتِ بسملؔ" کے نام سے دو حصّہ بخطِ ہندی شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ ان کی زبان کی سادگی کی وجہ سے اِن کا کلام لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ ہندی اور اُردو رسالوں میں کثرت سے اِن کے اشعار نکلتے ہیں۔ رسالہ "طوفان" الہ آباد کے بھی سب ایڈیٹر تھے۔ رسالہ "چاند" (اُردو) میں نظم کے حصّہ کے انتخاب اور مرتب کرنے میں انھوں نے میرا ہمیشہ ہاتھ بٹایا۔

ان کی عمر اس وقت ۳۲ سال کے لگ بھگ ہے۔ بڑے ملنسار، خوش خلق اور پُر مذاق آدمی ہیں۔ طبیعت شاعرانہ پائی ہے۔ آپ کے پڑھنے کا خاص انداز ہے جس سے سامعین پر بہت ہی اچھا اثر پڑتا ہے۔ مشاعروں میں معمولاً اپنے اُستاد کی تعریف میں ایک رُباعی پڑھتے ہیں اور پھر غزل پڑھتے ہیں۔

مَیں نے ہر غزل کے شروع میں یہ لکھ دیا ہے کہ وہ کس موقع پر پڑھی گئی۔ اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ قریب قریب ہر جگہ جہاں اُردو کا چرچا ہے وہاں مدعو ہو چکے ہیں اور اپنے کلام کا خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

"کرشن کنج" الہ آباد } دیوالی ۹ نومبر ۱۹۳۱ء　　کنھیا لال

دُعا

از ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی

مَیں دادِ سخن سب سے سوا دیتا ہوں
انعام زمانے سے جُدا دیتا ہوں
اللہ کرے خوش رہیں آباد رہیں
اے نوح یہ بسمل کو دُعا دیتا ہوں

بسمل میں سعادت بھی محبّت بھی ہے
بسمل میں نجابت بھی شرافت بھی ہے
اے نوح وہ لکھتے ہیں بہت خوب اشعار
سب کچھ ہے جہاں حُسنِ طبیعت بھی ہے

ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی مدظلہ

جذباتِ بسمل

رباعیات

جذباتِ بسمل

رُباعیات

۱۔ فلسفۂ ہستی

ایک ایک سے کہتی ہے زبانِ ہستی
بے کار ہیں سب نام و نشانِ ہستی
سودا نہ ہو سودا نہ کرو اے بسملؔ
بڑھ جائے گی اِک روز دُکانِ ہستی

(۲)

کیا تذکرہ وہم و گمانِ ہستی
مٹ جائے گا اک روز نشانِ ہستی
مٹی کا گھروندا اسے سمجھو بسملؔ
ذرّوں سے بنا ہے یہ مکانِ ہستی

(۳)

رہنے کا نہیں سوز و گدازِ ہستی
معلوم ہوا مرنے پہ رازِ ہستی
گو نغمے ہیں دلچسپ مگر اے بسملؔ
ٹوٹے گا کسی روز یہ سازِ ہستی

(۴)

آنکھیں ہوں تو دیکھے کوئی رازِ ہستی
دل ہو تو سُنے نغمۂ سازِ ہستی
کرتے ہیں وضو آبِ فنا سے بسملؔ
ہوتی ہے ادا آج نمازِ ہستی

(۵)

ہر موج ہے اک پردۂ سازِ ہستی
کُھلنے کو حبابوں سے ہے رازِ ہستی
کوشش نہ اُبھرنے کی کرو اے بسملؔ
غرقابِ فنا ہوگا جہازِ ہستی

(۶)

اللہ رے اللہ رے نازِ ہستی
پھر ناز کے ہم راہ نیازِ ہستی
اب تک ہے اسی فکر میں دُنیا بسملؔ
سمجھا نہ کسی نے کبھی رازِ ہستی

(۷)

کرتا ہوں بیاں سُنئے بیانِ ہستی
کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں شانِ ہستی
اس سانس کی بُنیاد ہی کیا اے بسملؔ
کندھے پہ ہوا کے ہے مکانِ ہستی

(۸)

معلوم بھی ہے کچھ تمھیں شانِ ہستی
تم کس لئے سنتے ہو بیانِ ہستی
رکنے کا نہیں تیرِ قضا اے بسملؔ
ٹوٹے گی کبھی جھک کے کمانِ ہستی

(۹)

دنیا کے دکھانے کو ہے دامِ ہستی
ہے نام فقط کچھ نہیں نامِ ہستی
کہتا تھا یہ ساقیِ ازل اے بسملؔ
کیا سوچ کے تم پیتے ہو جامِ ہستی

(۱۰)

بدنام زمانے میں ہے نامِ ہستی
کم زور ہے کم زور نظامِ ہستی
بسملؔ کبھی بھر کر یہ چھلک جائے گا
جامِ ابدی کچھ نہیں جامِ ہستی

(۱۱)

پایا نہ کسی نے بھی سراغِ ہستی
دنیا نے پیا بھر کر ایاغِ ہستی
جھونکا جو کبھی موت کا آیا بسملؔ
گل ہو گیا دم بھر میں چراغِ ہستی

(۱۲)

رشکِ گلِ ترکیوں بنے داغِ ہستی
ہو کس لئے گردوں پہ دماغِ ہستی
ہو جائے گا یہ سوکھ کے کانٹا بسملؔ
سرسبز نہیں رہنے کا باغِ ہستی

(۱۳)

کچھ سوچ سمجھ کر ہو نثارِ ہستی
اُترے گا کبھی دوش سے بارِ ہستی
پھُولو نہ بہت باغِ جہاں پر بسملؔ
دو دن کے لئے ہے یہ بہارِ ہستی

(۱۴)

کیوں ہوتے ہو بے کار نثارِ ہستی
کے دن کے لئے دار و مدارِ ہستی
آئے گی خزاں بن کے قضا اے بسملؔ
دھوکے کی یہ ٹٹی ہے بہارِ ہستی

(۱۵)

مٹ جائیں گے سب نقش و نگارِ ہستی
اَے شیفتۂ لَیل و نہارِ ہستی
غفلت میں کوئی دَم بھی نہ گذرے بسملؔ
ہر سانس پہ ہوتا ہے شمارِ ہستی

(۱۶)

بدمست نہ ہو دیکھ نثارِ ہستی
مَے خانۂ دُنیا ہے غُبارِ ہستی
رہنے کا نہیں اِس کا سُرور اے بسملؔ
اُترے گا کسی روز خُمارِ ہستی

(۱۷)

جتنا ہُوئے ہم بڑھ کے نثارِ ہستی
گھٹتا ہی گیا اُتنا وقارِ ہستی
دیکھا تو یہ صورت نظر آئی بسملؔ
مٹنے کو ہیں سب نقش و نگارِ ہستی

(۱۸)

اُڑ جائے گا ہر نقش و نگارِ ہستی
قائم نہیں رہنے کا وقارِ ہستی
آغاز سے انجام کو سوچو بسملؔ
ہے موت کے پہلو میں مزارِ ہستی

(۱۹)

رُکتا نہیں چل کر کبھی گامِ ہستی
منزل ہی پہ ہوتا ہے قیامِ ہستی
ہر سانس کی تم قدر کرو اے بسملؔ
موت آکے سُنائے گی پیامِ ہستی

(۲۰)

پُر کیفِ مسرّت نہیں جامِ ہستی
قائم نہیں رہتا کبھی نامِ ہستی
موت آئے تو مل جائے رہائی بسملؔ
کچھ دن کے لئے ہم ہیں غلامِ ہستی

(۲۱)

کیا آرزوئے منصب و جاہِ ہستی
کیا عزّت و توقیر گواہِ ہستی
اقلیمِ عدم نام ہے جس کا بسملؔ
جاتی ہے اُسی سمت کو راہِ ہستی

(۲۲)

رکھے ہوئے ہیں سر پہ جو تاجِ ہستی
دینا پڑے گا اُن کو خراجِ ہستی
بے اپنے کو مٹی میں ملائے بسملؔ
ممکن نہیں بل جائے مزاجِ ہستی

(۲۳)

یہ رنگ یہ انداز یہ طورِ ہستی
جب تک جیؤ سہتے رہو جورِ ہستی
اِس پھیر میں بھُولے سے نہ آنا بسملؔ
ہر دَور ہے اِک آخری دَورِ ہستی

(۲۴)

کس واسطے ہے مدح و ثنائے ہستی
ہے محوِ فنا لُطفِ بقائے ہستی
اِتراؤ نہ اِس خاک پہ تُم اَے بسملؔ
مِٹی میں مِلا دے گی ادائے ہستی

(۲۵)

جاتا ہے بہت جلد شبابِ ہستی
مَوت آکر اُلٹتی ہے نقابِ ہستی
مَے خانۂ دُنیا میں سنبھل اَے بسملؔ
بدمست نہ ہو پی کے شرابِ ہستی

(۲۶)

قائم نہیں رہنے کا حجابِ ہستی
اُٹھ جائے گی دَم بھر میں نقابِ ہستی
جب سر پہ قضا آئی تو سمجھے بسملؔ
چَونکے ہیں ابھی دیکھ کے خوابِ ہستی

(۲۷)

معلوم ہُوا حالِ عذابِ ہستی
ناحق تھی تمنّائے ثوابِ ہستی
ہستی کا نہیں کوئی جواب اَے بسملؔ
ہے مَوت حقیقت میں جوابِ ہستی

(۲۸)

کس کام کا کس کام کا اوجِ ہستی
امداد نہیں دینے کی موجِ ہستی
ڈوبوگے کبھی بحرِ فنا میں بسملؔ
اُٹھ اُٹھ کے یہی کہتی ہے موجِ ہستی

(۲۹)

کیوں دل میں کوئی لائے خیالِ ہستی
معلوم ہے اِک اِک کو مآلِ ہستی
آندھی اگر آئے گی فنا کی بسملؔ
گِر جائے گا جڑ سے یہ نہالِ ہستی

(۳۰)

ہُشیار ہو ہُشیار نثارِ ہستی
چُبھ جائے نہ دل میں کہیں خارِ ہستی
ہر رنگ سے کھِنچنا ہے مناسب بسملؔ
مِٹ جائے گی تصویرِ بہارِ ہستی

۲- سمجھتا ہوں میں

(۱)

میں دُوں کسے الزام سمجھتا ہوں میں
حالِ دلِ ناکام سمجھتا ہوں میں
ہر سانس تڑپنے کو ملی ہے بسملؔ
دم بھر نہیں آرام سمجھتا ہوں میں

(۲)

دَورِ سحر و شام سمجھتا ہوں مَیں
رازِ غمِ ایّام سمجھتا ہوں مَیں
جینا ہے تو مرنا بھی پڑے گا بسملؔ
آغاز کو انجام سمجھتا ہوں مَیں

(۳)

قدرت کا یہ دستور سمجھتا ہوں مَیں
مختار نہ مجبور سمجھتا ہوں مَیں
بسملؔ مری نظروں میں ہے وہ جلوۂ حُسن
ہر ذرّے کو اک طُور سمجھتا ہوں مَیں

(۴)

نزدیک سے کب دُور سمجھتا ہوں مَیں
یہ شیوہ و دستور سمجھتا ہوں مَیں
ہر سانس انا الحق نہ کہے کیوں بسملؔ
اپنے کو جو منصور سمجھتا ہوں مَیں

(۵)

حُسنِ خطِ تقدیر سمجھتا ہوں مَیں
ناکامیِ تدبیر سمجھتا ہوں مَیں
کیا شرح کروں تارِ نفس کی بسملؔ
چلتا ہُوا اِک تیر سمجھتا ہوں مَیں

(۶)

رنگِ فلکِ پیر سمجھتا ہوں مَیں
بے صبریِ تدبیر سمجھتا ہوں مَیں
قسمت سے ہیں مجبور جنابِ بسملؔ
اے گردشِ تقدیر سمجھتا ہوں مَیں

(۷)

الطاف و عنایت کو سمجھتا ہوں مَیں
اُلفت کو محبت کو سمجھتا ہوں مَیں
آگاہ ہوں آگاہ بخوبی بسملؔ
دُنیا کی حقیقت کو سمجھتا ہوں مَیں

(۸)

بے کار ہیں بے کار سمجھتا ہوں مَیں
آرام میں آزار سمجھتا ہوں مَیں
ہے رنگ بُرا باغِ جہاں کا بسملؔ
جو گُل ہے اُسے خار سمجھتا ہوں مَیں

(۹)

یہ ناز یہ انداز سمجھتا ہوں مَیں
پردے میں ہے جو راز سمجھتا ہوں مَیں
دم بھر کو بھی غافل نہیں رہتا بسملؔ
ہر سانس کی آواز سمجھتا ہوں مَیں

(۱۰)

اَطوار چلن گھات سمجھتا ہوں مَیں
دِن رات کو دِن رات سمجھتا ہوں مَیں
نیرنگیِ عالم سے ہوں واقف بسملؔ
دُنیا کی ہر اک بات سمجھتا ہوں مَیں

۳- بنارس

[یہ رباعیات ہندو یونیورسٹی اور کوئنس کالج، بنارس کے مشاعروں میں پڑھی گئیں]

(۱)

ہے جلوۂ حق کعبۂ اقدس کیا ہے
آئے نہ سمجھ میں تو مرا بس کیا ہے
آئی ہے طبیعت جو بُتوں پر بسمل
مجھ سے کوئی پوچھے کہ بنارس کیا ہے

(۲)

دل کہتا ہے اب کعبۂ اقدس دیکھو
جلوہ ہے الٰہی کا وہیں بس دیکھو
منظور جو درشن ہو بُتوں کا بسمل
پریاگ سے تم چل کے بنارس دیکھو

(۳)

یہ رائے بجا ہر کس و ناکس کی ہے
عزّت بہت اِس ارضِ مقدّس کی ہے
ہے جلوۂ حق جلوۂ بُت اے بسمل
دُنیا میں بڑی دھوم بنارس کی ہے

(۴)

مخصوص ہیں وہ پُن کے لئے جس کے لئے
جو ہیں شرف اِس ارضِ مقدس کے لئے
کیوں گھر سے نہ چلتا سرِ شام اے بسمل
بے چین تھا میں صبح بنارس کے لئے

(۵)

پُن والے کہو اُن کو کہو جَس والے
سب کچھ ہیں اِسی ارضِ مقدّس والے
ملتا ہے بُتوں کا انھیں درشن بسملؔ
تقدیر کے اچّھے ہیں بنارس والے

۴۔ متفرق

ہر وقت میسّر ہو نظارا تیرا
ملتا رہے گرتے کو سہارا تیرا
بسملؔ کا مددگار نہیں اور کوئی
کافی ہے اُسے صرف اشارا تیرا

دُنیا میں نہ دو دن بھی ٹھہرنا ہوگا
بے چون و چرا کام یہ کرنا ہوگا
جینے کی ضرورت ہمیں کیا تھی بسملؔ
معلوم جو ہوتا کبھی مرنا ہوگا

دُنیا میں بلندی کے لئے پستی ہے
دو دِن بھی جو رہتی نہیں وہ مستی ہے
مرجانے کو پیدا ہوئے ہم اے بسملؔ
انسان کی ہستی بھی کوئی ہستی ہے

ممنونِ توجہات و احساں کر دے
اتنا کہ رہِ شوق میں اپنا سر دے
یا رب ہے ترے در کا بھکاری بسملؔ
کاسہ جو گدائی کا لئے ہے بھر دے

بیٹھے ہوئے سر اپنا دھنا کرتے ہیں
اچھی بُری باتوں کو سُنا کرتے ہیں
ہے باغِ جہاں میں یہی کام اے بسملؔ
ہر رنگ کے ہم پھول چنا کرتے ہیں

ہر وقت نیا راز سُنا کرتا ہوں
بجتا ہوا اک ساز سُنا کرتا ہوں
بسملؔ کوئی غم خوار نہیں دل کے سوا
آپ اپنی ہی آواز سُنا کرتا ہوں

دل دل سے ہلاتے تھے مگر دل نہ ہلا
آپس میں ہلا دے کوئی کامل نہ ہلا
بسملؔ نظر آئے ہمیں لاکھوں بسمل
یہ بات تو ہے جھوٹ کہ قاتل نہ ہلا

مرغوب یہ چھپ جانے کا انداز نہیں
دل چسپ مرے واسطے یہ ناز نہیں
بسملؔ کو ہے پردے کی حقیقت معلوم
اس پردے میں پوشیدہ کوئی راز نہیں

واللہ یہ مُشکل کوئی مُشکل میں نہیں
رہ بر کی ضرورت کسی منزل میں نہیں
بسمل بھی پہنچ جائیں گے گرتے پڑتے
جب شوق نہیں دل میں تو کچھ دل میں نہیں

راحت نہیں دم بھر کبھی آرام نہیں
راحت کی کوئی صُبح نہیں شام نہیں
کیا لکھ گیا قسمت میں یہی روزِ ازل
بسمل کو تڑپنے کے سوا کام نہیں

یاروں کی محبّت کو غنیمت سمجھو
اس لُطف و عنایت کو غنیمت سمجھو
کیا دم کا بھروسہ ہے جہاں میں بسمل
دم بھر کی بھی صُحبت غنیمت سمجھو

پہُنچے نہ بُلندی پہ تو پستی کیا ہے
قائم نہ اگر رہ سکے مستی کیا ہے
ہستی پہ بہت ناز ہے سب کو بسمل
معلوم نہیں یہ بھی کہ ہستی کیا ہے

جذباتِ بسمل

نظمیں

اس مجموعہ میں جس قدر بھی مسدس ہیں وہ حسب فرمائش
بھائی کنھیا لال صاحب لکھے گئے ہیں (بسمل)
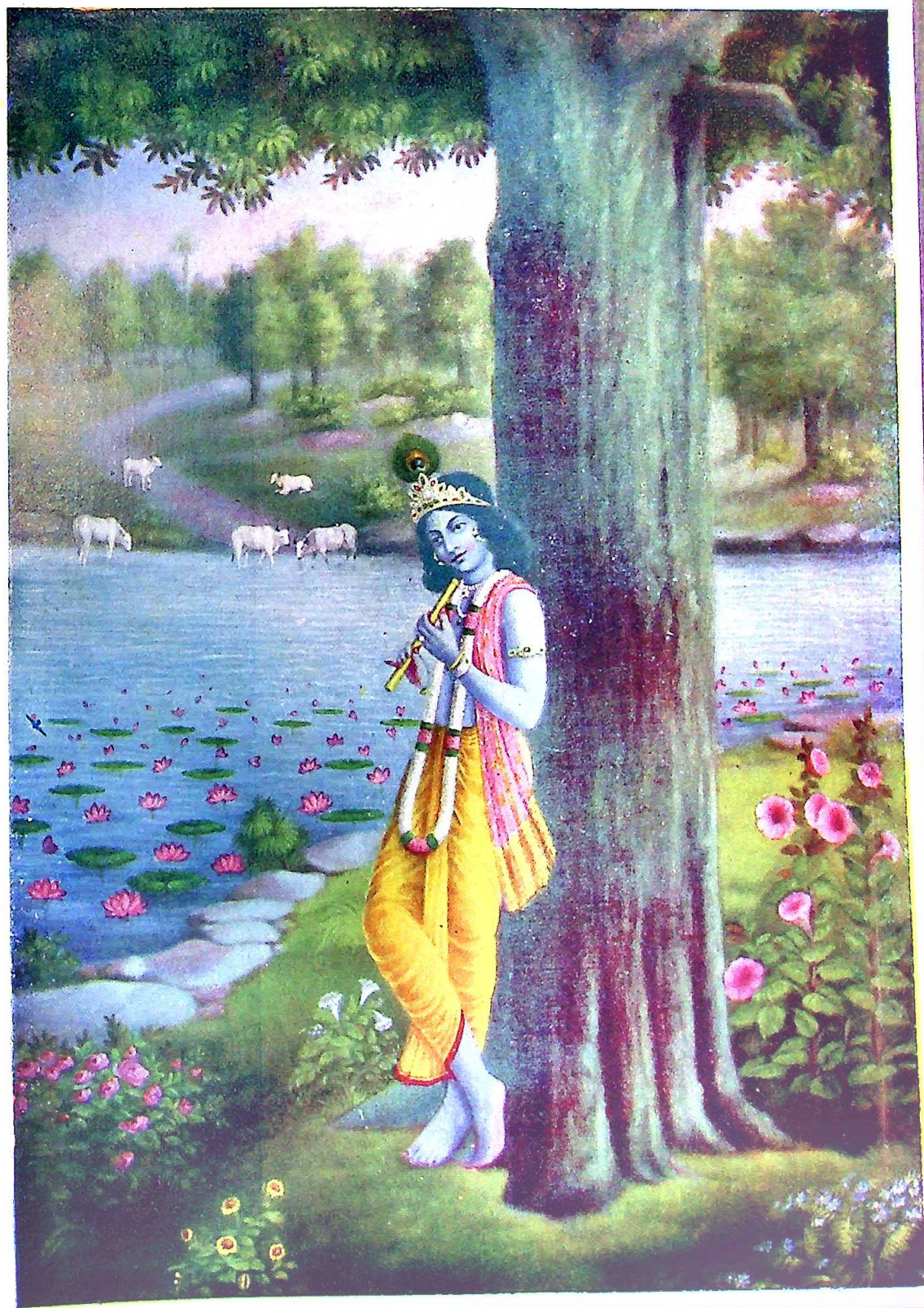
سری کرشن

[۲۰ اگست ۱۹۲۷ء کو کرشن گنج الہ آباد میں کرشن جنم اشٹمی منائی گئی تھی اُس جلسے میں یہ مسدس پڑھا گیا تھا۔ کنور مہراج سنگھ صاحب کمشنر الہ آباد صدر جلسہ تھے]

یہ وہ شب ہے جو نصیحت ہے زمانے کے لئے　　یہ وہ شب ہے جو عبادت ہے زمانے کے لئے
یہ وہ شب ہے جو مسرت ہے زمانے کے لئے　　یہ وہ شب ہے جو غنیمت ہے زمانے کے لئے
آج کی رات سیہ بخت ہمارا چمکا
آج کی رات اُمیدوں کا ستارا چمکا

رات بھادوں کی اندھیری تھی گھٹا چھائی تھی　　مژدۂ عیش و خوشی ساتھ لگا لائی تھی
کھلنے والی کلی دل کی نہیں مرجھائی تھی　　کنس کی موت اِسی پردے میں چھپی آئی تھی
لیا متھرا میں جنم جا کے رہا گوکل میں
پانو کے رکھتے ہی امرت ملا جمنا جل میں

وہ کنھیا وہ مرے دل کا نبھانے والا　　وہ زمانے میں نئے روپ سے آنے والا
وہ بھجن نغمۂ الہام بتانے والا　　وہ بڑے پریم سے بنسی کا بجانے والا
جلوۂ نورِ ازل عالمِ تنویر میں تھا
یعنی جو کچھ بھی تھا بس خاک کی تعمیر میں تھا

وہ نظر ہی نہیں جس کو نہیں حسرت اُس کی　　دل وہ کیا دل ہے نہیں جس کو محبت اُس کی
کھل گئی دیدۂ بینا پہ حقیقت اُس کی　　ایک ایک شئے نظر آتی ہے صورت اُس کی
شاہدِ معنیِ اسرار ظہورِ قدرت
سب پہ روشن تھا کہ وخاص تھا نورِ قدرت

نند کے لال جسودا کے دُلارے موہن سب کے بگڑے ہوئے سب کام سنوارے موہن
اس طرف بھی نگۂ لطف ہو پیارے موہن کچھ ہماری بھی سُنو آکے ہمارے موہن
ہو گئی زیر و زبر دیکھ لو دُنیا دِل کی
دِل ہی دِل میں رہی جاتی ہے تمنّا دل کی

دب گئے مِٹ گئے مغرور اُبھرنے والے نام سُن سُن کے ترا ڈرتے تھے ڈرنے والے
حسرتِ جور میں مرتے رہے مرنے والے ظُلم کو بھول گئے ظُلم کے کرنے والے
اُٹھ گئی چشمِ غضب کنس کی ہستی نہ رہی
خود پرستی نہ رہی قہر پرستی نہ رہی

گیان کی راہ زمانے کو دکھائی تُو نے پریم کیا چیز ہے یہ بات بتائی تُو نے
غم بھی تجھ کو ملے تکلیف بھی پائی تو نے دُور دُکھ ہو گیا مُرلی جو بجائی تُو نے
اِک نئی طرز نئی آن سے بولی بنسی
تٹ پہ جمنا کے عجب شان سے بولی بنسی

کس قیامت کا بھرا سوز ترے ساز میں ہے رنگِ اُلفت بھی نہاں خوبیِ انداز میں ہے
یہ بڑے جوش میں ہے اور بڑے ناز میں ہے گویا جادُو اِسی جادُو بھری آواز میں ہے
راگ کے وقت کوئی دُھن میں کوئی لَے میں ہے مست
دیکھتا ہوں جسے اچھّی طرح وہ نَے میں ہے مست

اپنی قوّت کو بڑے جوش میں لانے والا اُنگلیوں پر وہ گوردھن کو نچانے والا
وہ سُداما کی غریبی کا مِٹانے والا کام سنکٹ میں ہر اک شخص کے آنے والا
اب بھی آفاق کے لب پر ہے فسانہ تیرا
یاد ہے یاد زمانے کو زمانہ تیرا

تیرے ہوتے نہ کوئی درپئے آزار رہا　　تیرے ہوتے نہ جفا کار جفا کار رہا
بے کسوں کے لئے ہر حال میں غم خوار رہا　　دھرم کے واسطے ارجن کا مددگار رہا

کوروؤں کا وہ غرور اور نشاں تک نہ بچا
رَن میں سب قتل ہوئے ایک جواں تک نہ بچا

نہ ہوا ہے نہ کوئی ہوگا ترا ثانی بھی　　ایسا یوگی بھی کہیں ایسا کہیں گیانی بھی
دان کو سُن کے چھپے شرم سے سب دانی بھی　　مِٹ گئی دم سے ترے شانِ ستم رانی بھی

غور سے دیکھیں ذرا لوگ تماشا کیا ہے
تُو نے گیتا میں بتایا ہے کہ دُنیا کیا ہے

کلکِ قُدرت سے ہے اِنسان کی تقدیر بنی　　خاک کے ذرّوں سے ہے خاک کی تصویر بنی
قابلِ دید ہر اک شکل کی تحریر بنی　　رشتۂ تارِ نفس کی نئی زنجیر بنی

آگ ہے خاک ہے پانی ہے ہوا شامل ہے
چار عنصر نہ ہوں تو زیست بہت مُشکل ہے

یہ سمجھتے نہیں کم عقل اُبھرنے والے　　کہ بگڑ جائیں گے اک روز سنورنے والے
کام کرنے کے جو ہیں کر لیں وہ کرنے والے　　جینے والے نہیں آخر کو ہیں مرنے والے

کیوں مٹے جاتے ہیں دل اپنا لگانے کے لئے
آئے ہیں دہر میں سب دہر سے جانے کے لئے

زندگی کیا ہے کُھلی اِس کی حقیقت کیسی　　موت کیا چیز ہے کی تو نے نصیحت کیسی
دیش کے واسطے بے لاگ تھی اُلفت کیسی　　تیرے ہی دم سے ہوئی دھرم کی عزت کیسی

دھرم کا آج کہیں ذکر نہیں نام نہیں
کیوں نہ اندھیر ہو موجود یہاں شیام نہیں

آجا آجا اِدھر اے نند دُلارے آجا پھر وہ بنسی لئے جمنا کے کنارے آجا
پردۂ غیب سے ہو جائیں اِشارے آجا اب نہیں تاب غمِ ہجر کی پیارے آجا
آ کنھیا کہ ترے واسطے ہم بسمل ہیں
کہنے سُننے کے لئے دل ہے مگر بے دل ہیں

جمنا جی

ناز کیوں ہو نہ تجھے کرشن دُلاری جمنا تُو تو رادھا کی سہیلی بنی پیاری جمنا
رُتبہ عالی ہے ترا مرتبہ بھاری جمنا ہر جگہ فیضِ اتم رہتا ہے جاری جمنا
ہے یقیں گرم کسی دن بھری محفل ہوگی
راس منڈل کی وہ لیلا لبِ ساحل ہوگی

مٹ گیا لُطف ترا چھن گیا گہنا تیرا جب کنھیا نہیں بے لُطف ہے رہنا تیرا
غم اُٹھانا ستم و جَور کو سہنا تیرا پانی ہو ہو کے شب و روز یہ بہنا تیرا
آتشِ ہجر کچھ اِس درجہ لگی ہے تن میں
دل نہ متھرا میں بہلتا ہے نہ بندرا بن میں

بات بگڑی نہیں اب بھی ہے وہی بات تری وہی جاڑا وہی گرمی وہی برسات تری
دن اُسی ڈھنگ اُسی رنگ کی ہے رات تری کون کہہ سکتا ہے کچھ بھی نہیں اوقات تری
کرشن صدقے ہیں تو رادھا ہیں فدائی جمنا
ہر طرف خلق میں ہے تیری دُہائی جمنا

سادی سادی ہے رَوِش وضع ہے بھولی بھالی	ہے روانی بھی غضب چال بھی ہے مُتوالی
نیلی مَوجوں سے پشیماں ہوئیں زُلفیں کالی	حُسن و آرائش و زینت سے بڑھی خوش حالی

اللہ اللہ رے اِس ناز و ادا کی ہستی
تیرے آگے نہیں کُچھ آبِ بقا کی ہستی

پُوچھے رادھا سے کوئی قدرِ حقیقت تیری	کرشن سے جانچے کوئی خوبیِ عزّت تیری
ساری دُنیا میں ہے پھیلی ہوئی عظمت تیری	اُس کو جنّت مِلی کی جس نے بھی خدمت تیری

اپنا ہم رُتبہ جو پایا تجھے گنگا جی نے
اپنے پہلو میں بٹھایا تجھے گنگا جی نے

باعثِ ناز ہے بے شبہہ ہمالا کے لئے	سببِ فخر و شرف گوکُل و متھرا کے لئے
خاص اک نعمتِ حق وادی و صحرا کے لئے	مختصر یہ ہے بڑی چیز ہے دُنیا کے لئے

دل کی سربستہ کلی فرطِ خوشی سے کھل جائے
اُس کو امرت ملے جس کو ترا پانی مل جائے

سچ ہے اسرارِ حقیقت کا خزانہ تُو ہے	حال و مستقبل و ماضی کا زمانہ تُو ہے
لُطف آگیں طرب آمیز فسانہ تُو ہے	سب ہیں بے گانے اگر ہے تو یگانہ تُو ہے

صاف آئینے کی صورت ہے صفائی تیری
بندگی کیوں نہ کرے ساری خدائی تیری

نگہِ فضل و ترحّم سے اشارا کر دے	جو نہ ہو کام کسی سے وہ خدارا کر دے
رنج و غم درد و قلق دُور ہمارا کر دے	پیاری مخلوق میں کچھ اور بھی پیارا کر دے

رہ نُمائی تری بسمل کے لئے سب کچھ ہے
ناخدائی تری بسمل کے لئے سب کچھ ہے

مہاتما گاندھی

سُنا رہا ہوں تمھیں داستان گاندھی کی زمانے بھر سے نرالی ہے شان گاندھی کی
رہے رہے نہ رہے اس میں جان گاندھی کی نہ رُک سکی نہ رُکے گی زبان گاندھی کی
یہی سبب ہے جو وہ دل سے سب کو پیارا ہے
وطن کا اپنے چمکتا ہُوا ستارا ہے

بنا تھا مست کوئی اور کوئی سودائی ہر ایک سمت تھی غفلت کی جب گھٹا چھائی
تو اُس کی عقلِ رسا کام وقت پر آئی مریض مُلک ہے ممنونِ چارہ فرمائی
نئے خیال میں اک اک کا دل اسیر ہُوا
اِدھر امیر ہُوا اور اُدھر فقیر ہُوا

جفا و جور نے کی خوب اپنی بربادی خراب حال نہ دن رات کیوں ہوں فریادی
بنا دیا تھا قفس کا بُری طرح عادی مگر ہے شُکر بلا ہم کو درسِ آزادی
زمانہ کہتا ہے گاندھی مہاتما وہ ہے
بشر نہیں ہے حقیقت میں دیوتا وہ ہے

جو دل میں یاد ہے تو لب پہ نام اُس کا ہے جو ہے تو ذکر فقط صبح و شام اُس کا ہے
بھلائی سب کی ہو جس سے وہ کام اُس کا ہے جہاں بھی جاؤ وہیں احترام اُس کا ہے
اُٹھائے سر کوئی کیا سر اُٹھا نہیں سکتا
مقابلے کے لئے آگے آ نہیں سکتا

کسی سے اُس کو محبت کسی سے اُلفت ہے کسی کو اُس کی ہے اُس کو کسی کی حسرت ہے
وفا و لُطف ترحّم کی خاص عادت ہے غرض کرم ہے مدارات ہے عنایت ہے
کسی کو دیکھ ہی سکتا نہیں ہے مشکل میں
یہ بات کیوں ہے کہ رکھتا ہے درد وہ دل میں

وہ مثلِ رُوحِ رواں عُنصرِ بدن کے لئے		وہ رشکِ شمعِ ہدایاتِ انجمن کے لئے
وہ خاص مُصلحِ کُل شیخ و برہمن کے لئے		وہ ایک ساغرِ نَو محفلِ کُہن کے لئے
لگن اُسے ہے کہ سب مالکِ وطن ہو جائیں
قفس سے چھوٹ کے زینت دہِ چمن ہو جائیں

نہ پاس توپ نہ گولہ نہ قبضے میں تلوار		جفا شعار سے ہوتا ہے برسرِ پیکار
وہ پاک شکل سے پیدا ہیں جوش کے آثار		زمانہ تابعِ ارشاد حکم پر تیار
کسی خیال سے چرخے کے بل پہ لڑتا ہے
کھڑی ہے فوج یہ تنہا مگر اکڑتا ہے

ہزار کوئی کہے کچھ خموش رہتا ہے		طرح طرح کے ستم دل پر اپنے سہتا ہے
سُنو سُنو کہ یہ اک کہنے والا کہتا ہے		کہاں سرشک ہیں آنکھوں سے خون بہتا ہے
جو آبرو تمھیں رکھنی ہو جوش میں آؤ
رہو نہ بے خود و بے ہوش ہوش میں آؤ

ندیم و مونس و یار و حبیب رہتے ہیں		اُسی کو گھیرے امیر و غریب رہتے ہیں
نصیب ور ہیں بڑے خوش نصیب رہتے ہیں		ادب کے ساتھ ادب سے ادیب رہتے ہیں
کوئی بتائے تو یوں دیکھ بھال کس کی ہے
جو اُس سے بات کرے یہ مجال کس کی ہے

انوکھی بات نرالی روش نیا ڈھب ہے		رفاہ عام سے رغبت ہے اور مطلب ہے
فقط ہے دین یہی بس یہی تو مذہب ہے		یہی خیال تھا پہلے یہی خیال اب ہے
اگر بجا ہے تو بسمل کی عرض بھی سُن لو
چمن ہے سامنے دو چار پھول تم چُن لو

جواہر لال نہرو

[پنڈت جواہر لال نہرو کی رہائی پر یہ مسدس "پرشوتم داس پارک الہ آباد" میں پڑھا گیا]

آج ہے باغِ وطن میں پھر بہار آئی ہوئی
آج مژدہ ہے مسرت کا صبا لائی ہوئی
آج گردوں پر نرالی ہے گھٹا چھائی ہوئی
آج پڑتی ہے نظر بے طور للچائی ہوئی
غیرتِ اکسیر رتبے میں چمن کی دھول ہے
ناشگفتہ جو کلی تھی وہ بھی کھل کر پھول ہے

مے کشوں کی آرزو ہے دور چلنا چاہیئے
وقت آپہنچا سنبھلنے کا سنبھلنا چاہیئے
خونِ دل کو جوش کھا کھا کر ابلنا چاہیئے
ایسے میں ارماں نہ کیوں نکلے نکلنا چاہیئے
پینے والے کہہ رہے ہیں یہ ہے پینے کی گھڑی
دیر اے ساقی نہ کر ہے مرنے جینے کی گھڑی

کیوں توقف اس قدر پینے پلانے کے لئے
کہہ دے مطرب سے کہ آئے جلد گانے کے لئے
منتظر ہیں اہلِ محفل لطف پانے کے لئے
ہو اشارہ آگ پانی میں لگانے کے لئے
کون کہتا ہے مجھے ڈر ڈر کے پیمانہ ملے
جی مرا بھر جائے یوں بھر بھر کے پیمانہ ملے

وہ مئے الفت کہ بے ہوشوں کو جس سے ہوش ہو
کوئی ساغر نوش ہو تو کوئی دریا نوش ہو
دیکھ کر بد مستیاں سارا جہاں خاموش ہو
اس قدر بڑھ جائے دل رگ رگ سے پیدا جوش ہو
قہر ڈھائیں گے غضب ڈھائیں گے آفت ڈھائیں گے
سرخ ڈورے سرخ آنکھوں کے قیامت ڈھائیں گے

انقلابات جہاں سب کہہ رہے ہیں حال کے

جوہری پرکھیں ذرا جوہر جواہر لال کے

ایک انوکھا رند ایسا بھی بھری محفل میں ہے　　جس کی حسرت جس کی خواہش ہر کسی کے دل میں ہے
سہل مشکل ہو گئی مشکل کہاں مشکل میں ہے　　قافلے کا قافلہ اب دامنِ منزل میں ہے

ناخدائی کے لئے حاجت روائی کے لئے
رہ نما اچھا ملا ہے رہ نمائی کے لئے

کیوں کسی کو مائلِ فریاد ہونا چاہیئے　　کس بنا پر خلق کو برباد ہونا چاہیئے
قیدِ غم سے ہر طرح آزاد ہونا چاہیئے　　شاد ہونا چاہیئے دل شاد ہونا چاہیئے

رات دن شام و سحر تدبیرِ آزادی رہے
سامنے نظروں کے بس تصویرِ آزادی رہے

سادگی سے سادگی کے ساتھ ناتا جوڑ کر　　عیش و عشرت سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ کر
ساری دُنیا چھوڑ کر سارا زمانہ چھوڑ کر　　چین اگر لے گا تو زنجیرِ غلامی توڑ کر

انقلاباتِ جہاں سب کہہ رہے ہیں حال کے
جوہری پرکھیں ذرا جوہر جواہر لال، کے

اس کی دُنیا اور ہی ہے اس کا عالم اور ہے　　اس کا دَرماں اور ہے اور اس کا مرہم اور ہے
جو سمٹ جاتا ہے لہرا کر وہ پرچم اور ہے　　سر کہیں خم ہو نہیں سکتا یہ دَم خم اور ہے

قدر و قیمت میں خدا رکھّے دُرِ نایاب ہے
آبرو موتی کی ہے کیا خوب آب و تاب ہے

دُھن کا پکا ہے اسے سودا ہے اپنے کام کا　　نام ہو دُنیا میں یہ طالب نہیں ہے نام کا
سامنا ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے آلام کا　　مشغلہ کب عیش کا کب تذکرہ آرام کا

خدمتِ مُلکی کو سوجی سے بھکاری بن گیا
یعنی آزادی کے مندر کا پجاری بن گیا

ہر طرف دُنیا میں ہے شہرا جواہر لال کا　　کام جو ہوتا ہے وہ اچھا جواہر لال کا
بانکپن ایک ایک نے دیکھا جواہر لال کا　　مانتے ہیں اہل دل لوہا جواہر لال کا
زور کی چلتی ہوئی آندھی جواہر لال ہے
درحقیقت پیرو گاندھی جواہر لال ہے

کوئی دیکھے تو وطن پر کس طرح قربان ہے　　چلتے پھرتے اِس کو آزادی ہی کا ارمان ہے
سچ کہا بسمل نے پیاری آن پیاری شان ہے　　سمجھو تو ہے دیوتا دیکھو تو یہ انسان ہے
کیا جواہر لال ہے سُن لو زبانِ حال سے
دو قدم ہر کام میں آگے ہے موتی لال سے

موتی لال نہرو

[۷ فروری ۱۹۳۱ء کو "پرشوتم داس پارک" الہ آباد میں یہ مسدس پڑھا گیا تھا]

آج گلزارِ جہاں میں ہے خزاں آئی ہوئی　　آج ہے مخلوق مغموم اور تڑپائی ہوئی
آج ہے اندوہ و حرماں کی گھٹا چھائی ہوئی　　آج بے ڈھب ہے کلی ہر دل کی کُمھلائی ہوئی
پتّی پتّی ڈالی ڈالی سر جھکائے غم میں ہے
ایک دو کا ذکر کیا سارا چمن ماتم میں ہے

دیکھتے ہی دیکھتے بدلا ہے میخانے کا رنگ　　پینے والوں میں کہاں مستی کہاں اگلی اُمنگ
ساغر و خُم دم بخود بگڑے ہوئے محفل کے رنگ　　رُسٹ گیا وہ لُطفِ رندی چل بسی ساری ترنگ
جام میں باقی نہیں مَے صرف خالی جام ہے
اور موتی لال سے ساقی کا لب پر نام ہے

یوں تو دنیا کے سمندر میں کمی ہوتی نہیں
لاکھوں موتی ہیں مگر اس آب کا موتی نہیں

جب نہیں ساقی تو لُطفِ انجمن حاصل نہیں دل ہی دل ہے صرف کوئی آرزوئے دل نہیں
حل کسی صورت سے ہو جائے یہ وہ مُشکل نہیں اہلِ محفل کی نظر میں بانیِ محفل نہیں

غیر ممکن ہے کہ آ جائے کہیں وہ ہوش میں
سو رہا ہے چین سے جو مَوت کی آغوش میں

مل نہیں سکتا کوئی لیڈر ہمیں اس آن کا کوئی رہ بر کوئی غم خوار اس نرالی شان کا
قول کا پورا تھا وہ پکّا بہت تھا دھیان کا دیس کی دُھن میں دکھایا کرتب اپنی تان کا

بادشاہی چھوڑ دی اُس نے چمن کے واسطے
لی فقیری ضعفِ پیری میں وطن کے واسطے

کام کرنے والے جو ہوں کام کرنا سیکھ جائیں پاؤں میدانِ سیاست میں وہ دھرنا سیکھ جائیں
یوں نڈر ہو کر حریفوں سے نہ ڈرنا سیکھ جائیں مُلک پر مرنا کسے کہتے ہیں مرنا سیکھ جائیں

جان جو کھوں خلق میں تھا کام موتی لال کا
رہتی دُنیا تک رہے گا نام موتی لال کا

بانکپن کے ساتھ وہ ہر آن موتی لال کی وہ سمندر پار عالی شان موتی لال کی
دَولتِ دُنیا رہی مہمان موتی لال کی حُبِّ قومی کے لئے تھی جان موتی لال کی

یوں تو دُنیا کے سمندر میں کمی ہوتی نہیں
لاکھوں موتی ہیں مگر اُس آب کا موتی نہیں

کیا صبا اُڑ کر خبر لائی الہ آباد میں مُردنی سی سب پہ کیوں چھائی الہ آباد میں
جمع ہیں کس کے تمنّائی الہ آباد میں لکھنؤ سے کس کی لاش آئی الہ آباد میں

لے گئے تھے بہرِ درماں سب اُسے پردیس میں
مَوت آ پہنچی وہاں بھی زندگی کے بھیس میں

صبر سے اہلِ وطن کو کام لینا چاہیے درسِ عبرت ان کو صبح و شام لینا چاہیے
رات دن اللہ کا بس نام لینا چاہیے روحِ موتی لال سے انعام لینا چاہیے
سب ہیں بسمل ہر طرف بسملؔ مچا کہرام ہے
کہتے ہیں مرنا جسے جینے کا وہ انجام ہے

لوکمانیہ تلک

مایۂ ہندوستاں تھا بال گنگا دھر تلک اس چمن کا باغباں تھا بال گنگا دھر تلک
خوش کلام و خوش بیاں تھا بال گنگا دھر تلک مہرباں تھا رازداں تھا بال گنگا دھر تلک
کون بھارت کی خبر لے اُس کے مر جانے کے بعد

پارسا تھا پارسا تھا بال گنگا دھر تلک بے ریا تھا بے ریا تھا بال گنگا دھر تلک
رہنما تھا رہنما تھا بال گنگا دھر تلک پیشوا تھا پیشوا تھا بال گنگا دھر تلک
کون بھارت کی خبر لے اُس کے مر جانے کے بعد

مُلک کی رُوحِ رواں تھا بال گنگا دھر تلک باعثِ آرامِ جاں تھا بال گنگا دھر تلک
ہر کسی کا قدرداں تھا بال گنگا دھر تلک اس زمیں پر آسماں تھا بال گنگا دھر تلک
کون بھارت کی خبر لے اُس کے مر جانے کے بعد

افتخارِ ہند تھا وہ بال گنگا دھر تلک جاں نثارِ ہند تھا وہ بال گنگا دھر تلک
نَو بہارِ ہند تھا وہ بال گنگا دھر تلک پاسدارِ ہند تھا وہ بال گنگا دھر تلک
کون بھارت کی خبر لے اُس کے مر جانے کے بعد

مردِ میدانِ سیاست بال گنگا دھر تلک با مُروّت با محبت بال گنگا دھر تلک
صاحبِ اقبال و شوکت بال گنگا دھر تلک پاک صورت پاک سیرت بال گنگا دھر تلک
کون بھارت کی خبر لے اُس کے مر جانے کے بعد

زینت باغ وطن تھا بال گنگا دھر تلک
اک پھلا پھولا چمن تھا بال گنگا دھر تلک

ہر گھڑی سینہ سپر تھا بال گنگا دھر تلک　　کتنا بے خوف و خطر تھا بال گنگا دھر تلک
دل جاوں سے باخبر تھا بال گنگا دھر تلک　　سب کا منظورِ نظر تھا بال گنگا دھر تلک

کون بھارت کی خبر لے اُس کے مرجانے کے بعد

زینتِ باغِ وطن تھا بال گنگا دھر تلک　　اک پھلا پھولا چمن تھا بال گنگا دھر تلک
نوحہ خوان و نعرہ زن تھا بال گنگا دھر تلک　　واقفِ رنج و محن تھا بال گنگا دھر تلک

کون بھارت کی خبر لے اُس کے مرجانے کے بعد

رہ نمائی کر گیا وہ بال گنگا دھر تلک　　سر پر احساں دھر گیا وہ بال گنگا دھر تلک
کب کسی سے ڈر گیا وہ بال گنگا دھر تلک　　مرنے والا مر گیا وہ بال گنگا دھر تلک

کون بھارت کی خبر لے اُس کے مرجانے کے بعد

کاش پھر دُنیا میں آئے بال گنگا دھر تلک　　شکل پھر اپنی دکھائے بال گنگا دھر تلک
اور پھر گیتا سُنائے بال گنگا دھر تلک　　بسمل آکر پھر نہ جائے بال گنگا دھر تلک

کون بھارت کی خبر لے اُس کے مرجانے کے بعد

شوقِ آزادی

ازل سے شغل رہا شکرِ غم ادا کرنا　　علاوہ اِس کے زمانے میں کام کیا کرنا
نہ جانتے تھے کبھی شکوہ جور کا کرنا　　ہمیں وہی ادب شیوۂ وفا کرنا

وفا شعار سے بھی اپنے بے وفائی کی
بدل گئی ہے نظر اس لئے خدائی کی

ہر ایک سانس پہ ہم آہ آہ کرتے ہیں　　مگر کہاں وہ کرم کی نگاہ کرتے ہیں
بگڑ کر اور زیادہ تباہ کرتے ہیں　　نہ گھر نظر میں نہ دل ہی میں راہ کرتے ہیں

فلک اُلٹنے کو فریاد لب تک آئی ہے
سبب یہی ہے جو الزام بے وفائی ہے

ہم اپنا حال کہیں کیا کہ کہہ نہیں سکتے
وہ اپنے دل پہ ذرا جبر سہ نہیں سکتے
ہر شک آنکھوں سے بےکار بہ نہیں سکتے
بغیر رنگ کوئی لائے رہ نہیں سکتے

قرینہ کہتا ہے کون و مکاں کی خیر نہیں
زمیں کی خیر نہیں آسماں کی خیر نہیں

پیامِ عیش ہوائے بہار لائی ہے
خزاں کے چہرے پہ پژمردگی سی چھائی ہے
طرح طرح کی کلیجے نے چوٹ کھائی ہے
بہت دنوں میں مبارک یہ ساعت آئی ہے

قیامت اُٹھے جو سرگرم ہوں فغاں کے لئے
قفس نصیب تڑپتے ہیں آشیاں کے لئے

اُٹھا لے ہاتھ جفاؤں سے بدگماں صیّاد
کبھی تو سُن لے اسیروں کی داستاں صیّاد
دہن میں بند ابھی تک رہی زباں صیّاد
یہ کُھلنے والی ہے لینے کو امتحاں صیّاد

بنے گی بن کے دُلھن غیرتِ پری ڈالی
کچھ اور نکھرے گی اک اک ہری بھری ڈالی

جو عہد کر چکے ہیں اُس کو صاف کہنا ہے
کہ ہر طریق سے آزاد ہو کے رہنا ہے
نجات کے لئے زنجیر و طوق گہنا ہے
یہاں تو کھیل غرض ہر ستم کا سہنا ہے

بلا سے کچھ نہ ملے غم نہیں چمن رل جائے
وطن کے ہم ہیں ہمارا ہمیں وطن مل جائے

ہُوا ہے حکم نہ لے کوئی نامِ آزادی
پہنچنے پائے نہ ہرگز پیامِ آزادی
رہیں غلام نہ ہوں شادکامِ آزادی
نہ آئے دور میں بھولے سے جامِ آزادی

اسیرِ دام رہے ہم اسیرِ دام رہیں
اسی عذاب میں دن رات صبح و شام رہیں

چمن کے سارے فدائی چمن پہ مرتے ہیں　　ہزار جان سے توقیرِ ملک کرتے ہیں
کلیجا کانپ اُٹھے یوں آہِ سرد بھرتے ہیں　　جو کام ضبط سے لیں تو کہیں کہ ڈرتے ہیں
قفس کو لے اُڑیں قوّت ہے ایسی بازو میں
کسی خیال سے لیکن ہیں اپنے قابو میں

وفورِ غم سے بُرا حال ہے خدائی کا　　ہر ایک شخص کو رونا ہے بے وفائی کا
خیال جی میں نہ آئے کسی بُرائی کا　　ملے نصیب سے موقع اگر صفائی کا
بس اُٹھتے بیٹھتے حسرت ہے اور کیا دل کی
وہ جلد پوری ہو جو آرزو ہو بسمل کی

نالۂ قوم

[کایستھ کانفرنس الٰہ آباد ۱۹۲۵ء کے جلسہ میں یہ مسدس پڑھا گیا تھا۔]

دیکھ تو اے قوم تیری کیا سے کیا صورت ہوئی　　دیکھ تو اے قوم تیری رائگاں عزّت ہوئی
دیکھ تو اے قوم تیری کیا وہ سب دولت ہوئی　　دیکھ تو اے قوم تیری کیا وہ سب شہرت ہوئی
نیند سے اُٹھ ہوش میں آ اپنی آنکھیں کھول دے
کیا سبب اِس کا ہے آخر کچھ تو مُنہ سے بول دے

غیر عالم ہو نہ کیوں کر غیر عالم دیکھ کر　　دل نہ کیونکر کانپ اُٹھے کثرتِ غم دیکھ کر
دَم جو کرتے تھے نچھاور تجھ کو بے دَم دیکھ کر　　صورتِ تصویر ہیں خاموش اُنھیں ہم دیکھ کر
اس مصیبت سے رہائی کی کوئی تدبیر ہے
یا ہمیشہ کے لئے پھوٹی ہوئی تقدیر ہے

غفلتوں کو چھوڑ کر ہُشیار ہونا چاہئے تجھ کو ایسی نیند سے بیدار ہونا چاہئے
کَون کہتا ہے ذلیل و خوار ہونا چاہئے کام کرنے کے لئے تیّار ہونا چاہئے

مان کہنا غور کر آنکھوں سے آزادی کو دیکھ
تھی بلندی پر کبھی آج اپنی بربادی کو دیکھ

دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا میں رُسوا ہو گئی کیا تھی پہلے کیا ہے اب کیا رہ گئی کیا ہو گئی
بن گئی دھوکے کی ٹٹّی یہ کھلونا ہو گئی سب تماشائی ہیں تیرے تُو تماشا ہو گئی

تجھ کو اپنے حال پر پھر بھی خیال آتا نہیں
ہے تعجّب دل ترا غیرت سے شرماتا نہیں

کاہلی میں یہ زمانہ مُفت کھونے کا نہیں جاگنے کا وقت ہے یہ وقت سونے کا نہیں
کچھ نتیجہ کوئی حاصل تیرے رونے کا نہیں اب نہیں ہونے کا تو پھر کچھ بھی ہونے کا نہیں

دامنِ ہمّت کو ہاتھوں سے لپک کر تھام لے
اُٹھ قدم آگے کو رکھ پرماتما کا نام لے

تیری قوّت ہو وہی پھر تیری طاقت ہو وہی تیری وقعت ہو وہی پھر تیری عزّت ہو وہی
تیری شوکت ہو وہی پھر تیری دَولت ہو وہی تیری صورت ہو وہی پھر تیری سیرت ہو وہی

رنگ یوں بدلے اگر تیرا تو پھر کیا رنگ ہو
آنکھ کھُل جائے زمانے بھر کی دُنیا دنگ ہو

لُطف جب ہے دل سے ہو ایک اِک فدائے اتّفاق اپنے ماتھے سے لگائے خاک پائے اتّفاق
ہر گھڑی ہر دم رہے محوِ ثنائے اتّفاق کہہ رہے ہیں کہہ رہے ہیں آشنائے اتّفاق

حضرتِ بسمل کو لازم ہے اسی پر دھیان دیں
مال تو کیا چیز ہے عزّت کی خاطر جان دیں
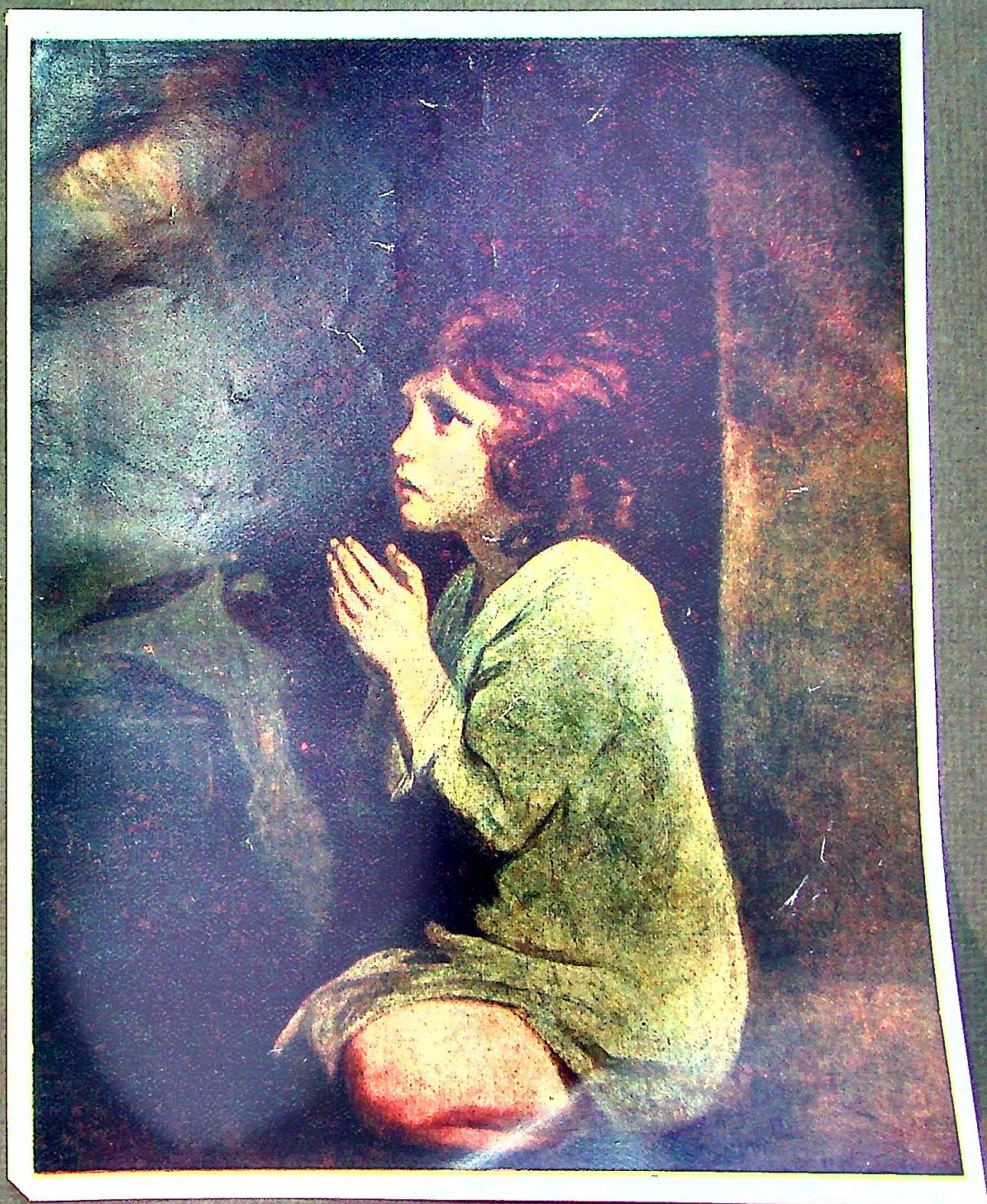
عہدِ طفلی

وہ گھڑی وہ دن وہ ساعت وہ زمانہ یاد ہے
عہدِ طفلی کا ہمیں ایک اک فسانہ یاد ہے
عیش و عشرت میں مگن تھے خرم و دل شاد تھے
غم تھا کوسوں دُور ہم سے غم سے ہم آزاد تھے
دل میں تھیں سُو سُو اُمنگیں حسرتوں کا جوش تھا
نیک و بد کیا چیز ہے اس کا ہمیں کب ہوش تھا
لُطف و راحت کی جھلک پاتے تھے ایک اک بات میں
مختصر یہ ہے کہ جنّت آگئی تھی ہات میں
کھانے پینے کھیلنے کا شغل صبح و شام تھا
اور دُنیا میں سوا اس کے ہمیں کیا کام تھا
غم سے ہم نا آشنا تھے کوئی ہم کو غم نہ تھا
اب جو عالم ہے نظر میں یہ کبھی عالم نہ تھا
ہوش آنا تھا بلا بن کر جوانی آ گئی
عیش کے بادل پھٹے غم کی مُصیبت چھا گئی
چار ہی دن میں مسرت کا زمانہ ہو چکا
نوحہ خوانی رہ گئی پچھلا ترانہ ہو چکا
اب وہ عالم اب وہ ارماں اور اب وہ دل کہاں
اب کہاں وہ دَورِ عالم حضرتِ بسمل کہاں

برسات کی شام

کس قدر دل کش سُہانی شام ہے برسات کی
بولنے والی ہے اب تصویر گویا رات کی

دامنِ مغرب میں پوشیدہ رُخِ خورشید ہے
آمد آمد ہے قمر کی اُس کا شوقِ دید ہے

خامۂ قدرت کے پائے ڈھب شفق کے رنگ میں
سر بہ سر ڈوبے ہوئے ہیں سب شفق کے رنگ میں

سر اُٹھا کر آسماں کی جامہ زیبی دیکھئے
اس کی رنگینی میں کیا ہے دل فریبی دیکھئے

یہ رُو پہلا یہ سُنہرا رنگ ہی کچھ اور ہے
رنگ ہی کچھ اور بے شک ڈھنگ ہی کچھ اور ہے

کام سونے کا بنا ہے گنبدِ افلاک پر
ضَو فگن ہوتا ہے عالم اُس کا فرشِ خاک پر

بزمِ گردُوں پر ہُوا ہے انجمن آرا کوئی
جھانکتا پردے سے ہے شاید یہ مہ پارا کوئی

میں نہ کیوں قُربان جاؤں اس ادا اِس ڈھنگ کے
آسماں پر کھل رہے ہیں پھول لاکھوں رنگ کے

ہیں لکیریں مُختلف رنگوں کی رنگیں داغ ہے
یہ خُدا کی شان ہے کیا آسماں پر باغ ہے

شام ہے برسات کی دل چسپ منظر ساتھ ہے
دیکھتے ہوتا ہے کیا قُدرت کا اس میں ہاتھ ہے

صورتِ تصویر چُپ بسملؔ ہوئے یہ بول کر
حُسن کی دُنیا ہے دیکھو دیدۂ دل کھول کر
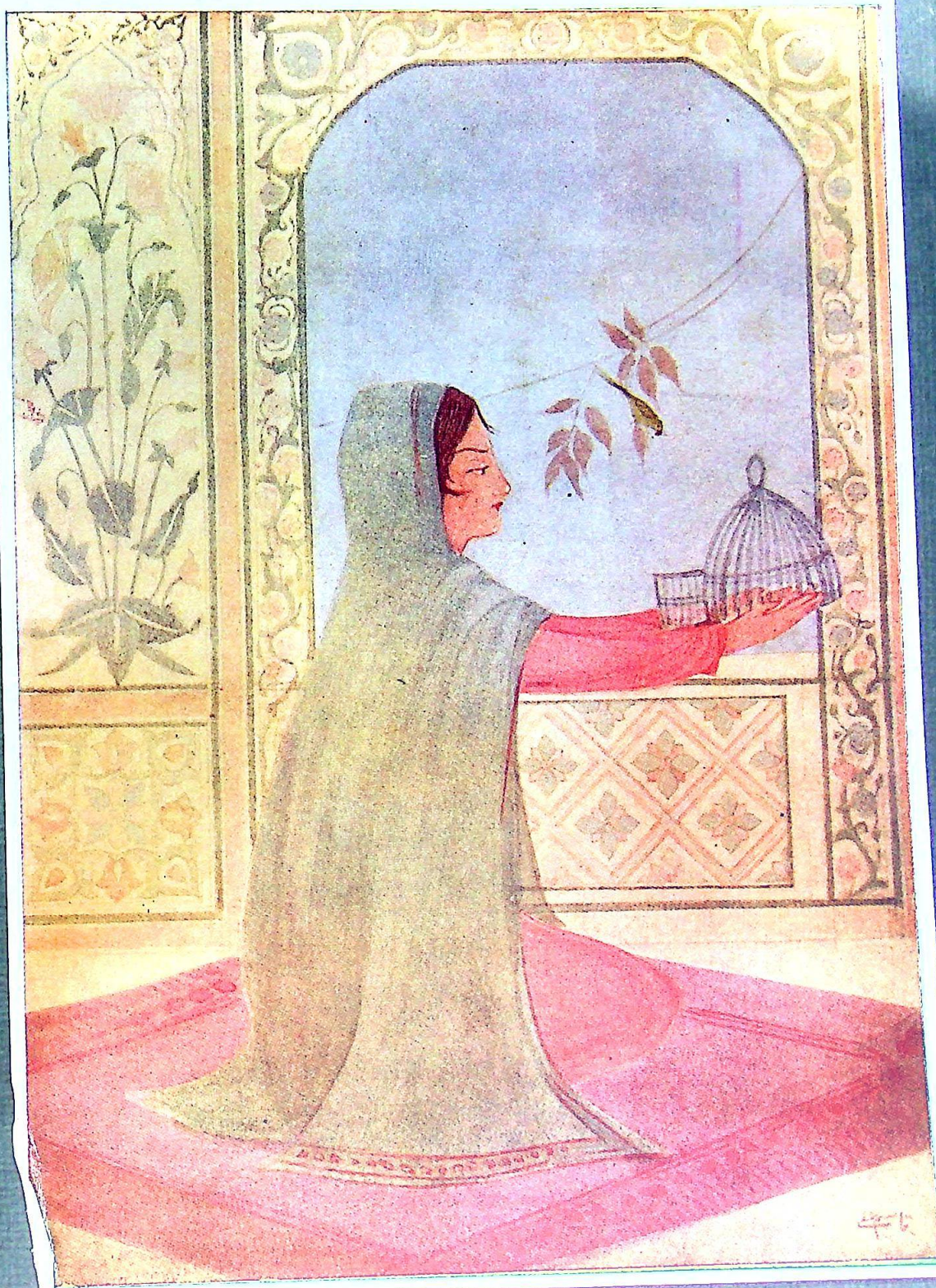
مکالمہ صیّاد و بلبل

مشاعرہ کایستھ پاٹ شالہ یونیورسٹی ہوسٹل الہ آباد ۵ ردسمبر سنہ ۱۹۲۷ء

صیّاد کی زبانی

میں جو کہتا ہوں اُسے غور سے سن اَے بُلبل — باغ کی یاد میں تُو سر کو نہ دُھن اَے بُلبل

دانہ پانی تجھے مل جائے اگر گھر بیٹھے — کیوں نہ آرام سے تُو آٹھ پہر گھر بیٹھے

کوئی موقع ہی نہیں تیری پریشانی کا — اب تو سامان بھی موجود ہے مہمانی کا

شاد و دل شاد قفس میں رہے مسرور رہے — برق و صرصر کی نگاہوں سے بہت دُور رہے

موسمِ گُل سے نہ مطلب نہ خزاں سے مطلب — الغرض تجھ کو نہیں دونوں سماں سے مطلب

رات کو فکر تو یہ مشغلہ ٹھہرا دن کا — آشیاں کے لئے تو چُنتی ہے تنکا تنکا

باغباں بھی کہیں اِتنے میں اگر آجائے — آشیاں شاخِ گُلِ تر پہ نہ رہنے پائے

یا اُجاڑے اِسے یا پھونک کے غارت کر دے — دو گھڑی میں تری محنت کو اکارت کر دے

رنج دے تجھ کو یہ منظر تری بربادی کا — دل نہ سُکھ پائے تو کیا لُطف ہے آزادی کا

کب ہیں آزاد جو آلام ہیں سہنے والے — ہاں مگر چین سے ہیں قید کے رہنے والے

مُبتلائے غم و آزار نہیں ہوتے ہیں — گھر میں صیّاد کے آرام سے سب سوتے ہیں

ہے مری رائے میں بہتر کہیں بربادی سے — ہاتھ اُٹھانا ہی ترا کوششِ آزادی سے

کون کہتا ہے کہ انجام جہاں پھول اِن پر — پھول مُرجھائیں گے دو دن میں نہ تو پھول ان پر

ہر کلی گُل کی طرح کھل کے ہے کھلنے والی — آج جو بات ہے وہ کل نہیں رہنے والی

بھول جا باغ کو پھولوں کا کبھی ذکر نہ کر — آشیاں خاک میں مل جائے تو کچھ فکر نہ کر

کوئی آفت کوئی زحمت نہیں لانے والا
دور ہے آنکھ سے ہر آنکھ دکھانے والا

گل و گلشن کے لئے نالۂ و فریاد نہ کر
شاد کر دل کو کسی دن اسے ناشاد نہ کر

گھر میں صیاد کے فریاد سے ہوتا کیا ہے
زور بازو میں اگر ہے تو نتیجا کیا ہے

صرف کہنے کے لئے قید ہیں آزاد نہیں
ورنہ فردوس سے کم خانۂ صیاد نہیں

جا و بے جا ترے احکام سے کب قاصر ہوں
تجھ کو جس بات کی تکلیف ہو میں حاضر ہوں

نہیں کرتا کبھی برتاؤ جو صیادی کا
پھر خدا جانے یہ کیوں دھیان ہے آزادی کا

اب قفس ہی کو سمجھ لے کہ چمن ہے میرا
یہ ہے گھر بار مرا اور وطن ہے میرا

بلبل کی زبانی

میرے صیاد بہت خوب ترا کہنا ہے
قید رہنا ہے کہ آزاد مجھے رہنا ہے

ہے جو بے درد تو پُر درد کہانی سن لے
دل سے جی سے بھی اسے میری زبانی سن لے

دانہ پانی تو وہی ہے جو ملے محنت سے
ڈر مصیبت سے نہیں خوف نہیں آفت سے

دُور گھر بیٹھے جو ہو جائے پریشانی بھی
قابلِ قدر نہیں پھر تری مہمانی بھی

جو ہیں پابند سمجھتے ہیں وہ کرنا کیا ہے
ہیں جو آزاد نہیں جانتے مرنا کیا ہے

فصل گل آتی ہے ایامِ خزاں آتے ہیں
ایک تصویر کے دو رُخ نظر آ جاتے ہیں

دل یہ کہتا ہے کہ ہو جی سے نثارِ گلشن
تنکا تنکا ہے نشیمن کا بہارِ گلشن

خانہ بر دوش کو کیا لطف تن آسانی ہے
تنکے تنکے کے لئے خاک بہت چھانی ہے

باغباں لاکھ رہے باغ میں بدظن میرا
ہو مگر شاخِ گلِ تر پہ نشیمن میرا

آگ دے دے کے اُجاڑے کہ وہ برباد کرے
غم نہ اس ظلم و ستم کا دلِ ناشاد کرے

روز تیار نیا ایک نشیمن ہوگا
کیا ضرر ہوگا جو مجھ سے کوئی بدظن ہوگا

اُن کو پروا نہیں ہوتی کبھی بربادی کی　　ہے ازل ہی سے تمنّا جنھیں آزادی کی

سَو طرح کے غم و آزار ہیں سہنے والے　　باز تدبیر سے اپنی نہیں رہنے والے

غنچۂ دل کہیں کُھلتا ہے کہیں کِھلتا ہے　　قید میں قیدیوں کو چین کہاں مِلتا ہے

کم سمجھ یہ بھی ہے موقع کوئی سمجھانے کا　　مَیں قفس میں ہوں نہیں مجھ کو قرار آنے کا

دل وہ رکھتے نہیں ڈرتے ہیں جو بربادی سے　　میں ہوں آزاد مجھے کام ہے آزادی سے

چند روزہ سہی گُل پھر بھی ہیں جانِ بُلبُل　　ان سے بڑھتی ہے بہت عزّت و شانِ بُلبُل

اس پہ کس کی ہے نظر اس پہ نظر کس کو ہے　　ہے خبر آج کی تو کل کی خبر کس کو ہے

سَیرِ گلشن جو نظر آئے تو فریاد نہ ہو　　کوئی نالاں نہ ہو گریاں نہ ہو ناشاد نہ ہو

ظُلم سے قہر سے آزار سے بے داد سے کام　　مُرغِ گلشن کو ہے کیا خانۂ صیّاد سے کام

درسِ عبرت ہے جہاں کو مری بربادی بھی　　ہائے کیا چیز زمانے میں ہے آزادی بھی

لُطف اُٹھانے کے لئے اپنا چمن ہے سب کچھ
سچ یہ بسمل نے کہا ہے کہ وطن ہے سب کچھ

جذباتِ بسمل

غزلیات

غزلیات

مشاعرہ ہندو بورڈنگ ہاوس الہ آباد - ۱۵ / نومبر ۱۹۲۵ء

یاد آتا ہے سماں مجھ کو خود آرائی کا
چاندنی رات میں عالم تری انگڑائی کا

آئینہ آئینہ رویوں کو یہ دیتا ہے سبق
کچھ سمجھ بوجھ کے دعویٰ کرو یکتائی کا

اور بھی جوش بڑھا ہو گئیں موجیں بے تاب
عکس دریا میں پڑا جب تری انگڑائی کا

میرے دل میں مری آنکھوں میں ہیں تیری شکلیں
زیب دیتا نہیں دعویٰ تجھے یکتائی کا

دل ہوا زیر و زبر آہ بھی ہم کر نہ سکے
رہ گئے دیکھ کے نقشہ تری انگڑائی کا

میں قفس میں ہوں گلستاں میں خزاں ہو کہ بہار
ذکر مجھ سے نہ کرے کوئی گئی آئی کا

ہاتھ اُٹھنا تھا کہ دُنیا میں قیامت اُٹھی
بن گیا ایک فسانہ تری انگڑائی کا

جلنے مرنے کے لئے آئے پتنگے سر بزم
شمع اب شوق کرے انجمن آرائی کا

چشمِ مشتاق میں رہ رہ کے کھنچا کرتا ہے
وہی عالم وہی نقشہ تری انگڑائی کا

جب سے جلوہ سرِ دیوار نظر آیا ہے
آسماں پر ہے دماغ اُن کے تماشائی کا

تم بُلاتے تھے جسے پیار سے بسملؔ کہہ کر
آج اُٹھتا ہے جنازہ اُسی شیدائی کا

مشاعرہ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ ۲۴ر فروری ۱۹۲۴ء

اتنا بھی نہ ساقی ہوش رہا پی کر ہمیں کیا مے خانہ تھا
گردش میں ہماری قسمت تھی چکر میں ترا پیمانہ تھا

محروم تھا سوزِ اُلفت سے جل جانے سے بے گانہ تھا
فانوس کے اندر شمع رہی باہر پروانہ تھا

مے خانہ سے ہم رخصت جو ہوئے تو اور ہی کچھ مے خانہ تھا
اک کونے میں خُم رکھا تھا اک گوشے میں پیمانہ تھا

ہوں رنگِ محبت سے واقف ہوں سوزِ محبت سے واقف
گلزار میں بُلبُل میں تھا کبھی محفل میں کبھی پروانہ تھا

دامن میں جو چُن کر رکھتا تھا سب جیب و گریباں کے ٹکڑے
ہُشیار وہی دیوانہ تھا دیوانہ وہ کب دیوانہ تھا

مانا کہ ہے روشن بزمِ جہاں اے شمع تری دل سوزی سے
کیوں ہاتھ میں ہر پروانے کے جل مرنے کا پروانہ تھا

رندوں کا تو کوئی ذکر نہیں زاہد بھی بہک جاتے ساقی
رفتار تری مستانی تھی انداز ترا مستانہ تھا

مطلب ہے عبادت سے مجھ کو مطلب ہے پرستش سے مجھ کو
جس در پہ جھکایا سر میں نے کعبہ تھا وہی بُت خانہ تھا

وہ شمع نہ تھی وہ بزم نہ تھی وہ صبح کو اہلِ بزم نہ تھے
بس یاد دلانے کی خاطر انبارِ پرِ پروانہ تھا

کندھے پہ لئے سب اہلِ جنوں بسمل کا جنازہ جاتے تھے
تھا چاک کفن اِس واسطے وہ ہر شخص کہے دیوانہ تھا

مشاعرہ کیننگ کالج مسلم ہوسٹل یونین لکھنؤ ۱۹ جنوری ۱۹۲۹ء

کسی طرح بھی کسی سے نہ دل لگانا تھا
خیالِ یار میں دُنیا کو بھول جانا تھا

جو بے رُخی تھی یہی رُخ یونہیں چھپانا تھا
مرے خیال میں بھی آپ کو نہ آنا تھا

اسی سبب سے وہ پردے میں چھپ کے بیٹھے ہیں
کہ پردے پردے میں کچھ اُن کو رنگ لانا تھا

ازل سے رُوح جو پھونکی گئی ہے ذرّوں میں
تو یہ سمجھ لو کہ جلوہ اُسے دکھانا تھا

زمانہ کھینچ کے پہنچتا ہے اپنے مرکز پر
ضرور دائرۂ زندگی میں آنا تھا

ملے ہیں اس لئے آپس میں خاک کے ذرّے
نیا نیا انھیں ہر روز رُوپ لانا تھا

ازل کے روز سے پردے میں بیٹھنے والے
ہمارے سامنے تجھ کو کبھی تو آنا تھا

گلوں کا نام ہوا باغِ حُسن میں لیکن
ہر ایک رنگ سے جلوہ اُسے دکھانا تھا

زہے نصیب کہ مر کر ملے مراتبِ عشق
مجھے تو ہیچ مری زندگی نے جانا تھا

کلیم سے یہ کہا برقِ طُور نے سرِ طُور
مجھے تو آپ کی آنکھوں کو آزمانا تھا

نہاں ہے خاک کے ذرّوں میں جلوۂ قدرت
بشر بنا کر اُسے اپنے کو دکھانا تھا

مِلی ہے دادِ سخن لکھنؤ میں اے بسملؔ
وطن سے دُور مبارک ہمارا آنا تھا

مشاعرہ آل انڈیا اورنیٹل کانفرنس پٹنہ ۱۷ دسمبر ۱۹۳۰ء

دل میں تیرِ نگۂ ناز کا مہماں ہونا
کوئی مشکل نہیں اب اس کو رگِ جاں ہونا

ہر گھڑی شیفتۂ کاکُلِ جاناں ہونا
کھیل ہے میرے لئے داخلِ زنداں ہونا

لوگ سمجھیں نہ کہیں اس کا یہی قاتل ہے
تم مری لاش پہ کچھ سوچ کے گریاں ہونا

دشت پیما کے لئے عرصۂ آفاق ہے تنگ
ذرّے ذرّے کو مناسب تھا بیاباں ہونا

میں اسے شرم کہوں یا اسے شوخی سمجھوں
کبھی چُھپنا کبھی پردے سے نُمایاں ہونا

کہہ گیا جامۂ ہستی کے اُڑیں گے پُرزے
تیری چلتی ہوئی شمشیر کا عُریاں ہونا

کر چُکا چاک تو کیا بخیہ گری سے حاصل
اب گریبان کو مشکل ہے گریباں ہونا

آئینہ دیکھنے کو شوق سے دیکھو لیکن
اپنی صورت نہ کہیں دیکھ کے حیراں ہونا

موسمِ گُل کا تصوّر بھی نشیمن کی بھی فکر
وہ قفس ہی میں مرا محوِ گلستاں ہونا

ہر گھڑی یادِ بُتاں رہتی ہے دل میں بسملؔ
کوئی آساں نہیں ہندو کا مُسلماں ہونا

مشاعرہ دریا آباد الہ آباد ۱۹ جنوری ۱۹۲۲ء

خاں صاحب آغا علی خاں صاحب کے اہتمام سے یہ مشاعرہ ہوا تھا

جو نہ کرنا تھا کیا جو کچھ نہ ہونا تھا ہُوا
چار دن کی زندگی میں کیا کہیں کیا کیا ہُوا

یہ سمجھ کر ہم نہیں کہتے کسی سے رازِ دل
اِس طرف نکلا زباں سے اُس طرف چرچا ہُوا

بھر کے ٹھنڈی سانس لیں بیمار نے جب کروٹیں
وہ کلیجہ تھام کر کہنے لگے یہ کیا ہُوا

سُنئے سُنئے آتشِ غم سے ہوئے ہم جل کے خاک
کہئے کہئے اب کلیجہ آپ کا ٹھنڈا ہُوا

میرے چہرے سے عیاں ہے دیکھ لو پہچان لو
یہ نہ پوچھو دل کا عالم دل کا نقشہ کیا ہُوا

دیکھ لو دم توڑتا ہے کس طرح بیمارِ غم
خیر ہے تم آ گئے بالیں پہ یہ اچّھا ہُوا

کون رویا لاش پر کس نے جلائی آ کے شمع
ہم کو اس کی کیا خبر جب مر گئے تو کیا ہوا

قتل گہ میں دیکھی جاتی تھی نہ قاتل سے تڑپ
وہ بھی کہتا ہے کہ بسمل مر گیا اچّھا ہُوا

---

۱۴ اپریل ۱۹۲۰ء

حسب فرمائش منشی رام نراین پرشاد صاحب ایڈوکیٹ الہ آباد

احباب دیکھتے ہیں جو مُنہ چارہ ساز کا
شاید ہے خاتمہ مری عمرِ دراز کا

اب سامنا ہے رازِ حقیقت نواز کا
پردہ اُلٹ دیا مرے دل نے مجاز کا

جب چشمِ غور سے کبھی دل پر نگاہ کی
آئینہ حال ہو گیا آئینہ ساز کا

دُنیائے ذوق و شوق پر آئیں گی آفتیں
عُقدہ کُھلے گا جب مرے سربستہ راز کا

کہتا ہوں ہم نشیں سے یہ تارِ نفس نہیں
پھندا گلے میں ہے کسی زُلفِ دراز کا

دم توڑتا نہیں شبِ فرقت مریضِ غم
کھٹکا لگا ہُوا ہے جو افشائے راز کا

بسمل کو کس لئے کوئی سمجھے نہ حق پرست
یہ بُت کدے میں شوق سے پڑھنا نماز کا

۱۶ اپریل ۱۹۲۵ء

حسب فرمائش منشی مہادیو پرشاد سری واستو ایم - اے ایل ایل - بی - الہ آباد

نہ رہے تم جو ہمارے تو سہارا نہ رہا　　کوئی دُنیائے محبت میں ہمارا نہ رہا

اب کوئی اور زمانے میں سہارا نہ رہا　　جس کو کہتے تھے ہمارا ہے ہمارا نہ رہا

دے دیا حضرتِ عیسیٰ نے اُسے صاف جواب　　تیرے بیمار کا اب کوئی سہارا نہ رہا

کیا کہیں حال زمانے کا خلاصہ یہ ہے　　تم ہمارے نہ رہے کوئی ہمارا نہ رہا

کیا کہوں انجمنِ ناز کا حال اے بسمل

سب کے چرچے رہے بس ذکر تمہارا نہ رہا

---

۱۵ مئی ۱۹۲۱ء - حسب فرمائش منشی بلدیو پرشاد صاحب، الہ آباد

دُنیائے عاشقی میں ایک انقلاب ہوگا　　جب دل مرا نہ ہوگا عالم خراب ہوگا

یوں خاکِ دل سے پیدا ایک انقلاب ہوگا　　ذرہ جو ہوگا اونچا وہ آفتاب ہوگا

بے پردہ آج کوئی مستِ شباب ہوگا　　ہم بھی خراب ہوں گے دل بھی خراب ہوگا

ہوگی جسے گوارا اُفتادگیِ اُلفت　　مٹی میں مل کر اک دن وہ کامیاب ہوگا

قالب میں رُوح اپنی داخل تو ہوگئی تھی　　معلوم یہ کسے تھا جینا عذاب ہوگا

ہم مجرموں کو یہ بھی محشر میں دیکھنا ہے

کس کس کا ایک دن میں بسمل حساب ہوگا

مشاعرہ بنارس ۲۰ فروری ۱۹۲۰ء

دل کی جو آگ تھی کم اُس کو بھی ہونے نہ دیا　　ہم تو روتے تھے مگر آپ نے رونے نہ دیا

شمع کیوں پردۂ فانوس میں چھپ جاتی ہے　　اس نے پروانے کو قربان بھی ہونے نہ دیا

یادِ دلبر ہیں کبھی اے دلِ مضطر تو نے　　ہم کو چپ چاپ کہیں بیٹھ کے رونے نہ دیا

آشیاں کا تو کوئی ذکر ہے کیا اے صیاد　　جمع تنکوں کو کبھی برق نے ہونے نہ دیا

آستیں آنکھوں پر اُس شوخ نے رکھ دی بسمل

رو رہا تھا مجھے کس واسطے رونے نہ دیا

مشاعرہ ماڈرن ہائی اسکول الہ آباد ۔ ۲۴ رفروری ۱۹۲۳ء

بہ قیدِ یک قافیہ

بعدِ فنا لحد پہ کوئی اشکبار تھا
دریائے غم کے موج میں میرا مزار تھا

جس مُشتِ خاک پر وہ بہت اشکبار تھا
دیکھا تو میرے دل کا نشانِ مزار تھا

جب وہ خرام ناز سے پامال کر چکے
تو سب سے پوچھتے ہیں یہ کس کا مزار تھا

پہنچے نہ فاتحہ کو وہ رستے سے پھر گئے
دو چار ہی قدم پہ ہمارا مزار تھا

مٹّی میں بھی دبے نہ گلِ داغِ آرزو
اُگتے تھے جس سے پھول وہ میرا مزار تھا

اللہ رے غبار وہ اِس پر بگڑ گئے
اونچا ذرا زمیں سے جو میرا مزار تھا

چلتے ہوئے وہ رَوند کے یہ بھی خبر نہیں
مٹّی کا ڈھیر تھا کہ کسی کا مزار تھا

آنسو بہائے دیکھنے والوں نے دیکھ کر
کچھ اِس طرح اُداس ہمارا مزار تھا

پھیلی ہوئی تھی گورِ غریباں میں روشنی
کیا آفتابِ حشر چراغِ مزار تھا

رویا نہ کوئی جس پہ وہ عاشق کی مَوت تھی
آیا نہ کوئی جس پہ وہ اُس کا مزار تھا

چھاپے تھے جس پہ خونِ تمنّا کے ہر طرف
وہ بسملِ ادا کا تمھارے مزار تھا

مشاعرہ آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس الہ آباد ۶ ر نومبر ۱۹۲۶ء

جلوۂ دیدارِ جاناں میں بھی کتنا جوش تھا
دیکھ کر مرنا پڑا جینے کا کس کو ہوش تھا

بےخودی میں ہو رہی تھی دل سے ہم سے گفتگو
کب یہ عالم تھا کہ جب سارا جہاں خاموش تھا

چبھ گئے کانٹے تو چھالے پھوٹ کر بہنے لگے
قطرۂ خوں میں بھی دریائے جنوں کا جوش تھا

دیکھ کر باغِ جہاں میں حسنِ فطرت کی بہار
ہوش میں دُنیا تھی دل والا مگر بےہوش تھا

لیجئے ٹوٹا نظامِ عالمِ ہستی کا ساز
دو گھڑی کے واسطے تارِ نفس پُرجوش تھا

زندگی پا کر ہُوا سارا زمانہ بےخبر
مَوت بھی آئے گی اک دن اِس کا کس کو ہوش تھا

رونے والوں نے اُٹھا رکھا تھا سر پر آسماں
جس گھڑی میرا جنازہ اُن کے زیبِ دوش تھا

دے سکا کچھ بھی نہ امداد اُف یہ مجبوریِ عشق
دِل بلا میں مبتلا تھا اور میں خاموش تھا

رنگِ گُل پہلے بنا پھر بن گیا رنگِ شفق
خونِ بسمل میں خدا جانے کہاں کا جوش تھا

۲۷ جنوری ۱۹۲۳ء حسب فرمائش منشی سورج پرشاد صاحب، الہ آباد

دم بھر کو بند نالۂ بُلبُل نہ ہو سکا　　لیکن اثر سے زرد رُخِ گُل نہ ہو سکا

وقتِ اخیر رو ہی دئے مجھ کو دیکھ کر　　وہ حال تھا کہ اُن سے تحمّل نہ ہو سکا

پوشیدہ ہر شرر میں ہے برقِ جمالِ حق　　دم بھر کو جزو سے تو جدا کُل نہ ہو سکا

اخفائے رازِ غم کا جو زنداں میں تھا خیال　　زنجیر بھی ہلائی مگر غُل نہ ہو سکا

داغِ جگر میں کیا ہے کمالِ فروغِ عشق　　ایسا جلا چراغ کہ پھر گُل نہ ہو سکا

سینے پہ سانپ لوٹ نہ جائے شبِ فراق　　اِس وہم میں تصوّرِ کاکُل نہ ہو سکا

مجبوریاں کچھ ایسی تھیں بسملؔ شبِ فراق
مجھ سے چراغِ زیست بھی تو گُل نہ ہو سکا

مشاعرہ الہ آباد ۲۱ اپریل ۱۹۲۶ء

فصلِ بہار آتے ہی عالم بدل گیا　　نکلا تھا گھر سے مَیں کہ گریباں نکل گیا

اللہ رے برقِ حُسن کی یہ گرم جوشیاں　　مُوسیٰ کو ہوش بھی نہ رہا طُور جل گیا

بُت خانے کی تلاش میں وہ بے خودی رہی　　مَیں دو قدم حرم سے بھی آگے نکل گیا

دیکھی گئی نہ گورِ غریباں کی بے کسی　　گُزرا اُدھر سے مَیں تو مرا جی دہل گیا

دل میں نہ ہے اُمید نہ حسرت نہ آرزو　　جو کُچھ تھا سوزِ غم سے وہ سامان جل گیا

وقتِ اخیر مُجھ کو جو حاصل ہوا سکون　　احباب دل میں سمجھے کہ یہ اب سنبھل گیا

دل میں بھری ہوئی تھی شہادت کی آرزو
قاتل کو اپنے دیکھ کے بسملؔ مچل گیا

طبع زاد ۔ ۲۰ نومبر ۱۹۲۰ء

جو رُخ کو دیکھ کے گیسوئے یار دیکھ لیا ــــ تو دل نے جلوۂ لیل و نہار دیکھ لیا
اُگل کے خونِ دلِ داغ دار دیکھ لیا ــــ خزاں میں ہم نے یہ رنگِ بہار دیکھ لیا
نہ یہ دُرست نہ وہ سچ نہ یہ بجا نہ وہ ٹھیک ــــ تُمھارا قول تُمھارا اقرار دیکھ لیا
جھلک دکھا کے وہ پردے میں بیٹھ جاتے تھے ــــ ہزار بار چُھپے ایک بار دیکھ لیا
نشاطِ دل کہیں خُم خانۂ جہاں میں نہیں ــــ سرور دیکھ کے ہم نے خُمار دیکھ لیا
یہ میرے جی میں سمائی کہ خاک ہو جاؤں ــــ تُمھارے دل کا جو میں نے غُبار دیکھ لیا
نہ آئی نیند نہ آئی قضا نہ آئے آپ ــــ تڑپ تڑپ کے شبِ انتظار دیکھ لیا
بُتوں کی شکل میں ہم نے بُتوں کی صورت میں ــــ ظُہورِ قُدرتِ پروردگار دیکھ لیا
سمجھ لیا کہ یہ ہے دل شکستۂ اُلفت ــــ کہیں کسی کا جو ٹوٹا مزار دیکھ لیا

چُھٹے گی حضرتِ بسمل نہ مے کشی تم سے
عجب طرح کے ہو تم بادہ خوار دیکھ لیا

مشاعرہ جون پور ۲۵ فروری ۱۹۲۶ء

جی بہلنے کے لئے باقی یہ ساماں رہ گیا ــــ دل سے ارماں تو گئے ہاں دل میں پیکاں رہ گیا
رُوح پھونکی بے خودی کی یوں تری تصویر نے ــــ صورتِ آئینہ مَیں بھی ہو کے حیراں رہ گیا
جلوہ گاہِ ناز میں آنکھیں ملیں نظریں ملیں ــــ اُن سے ملنے کو ہمارے دل میں ارماں رہ گیا
جب قفس میں یہ ہوا معلوم آ پہنچی بہار ــــ دیکھ کر حسرت سے مَیں سُوئے گلستاں رہ گیا
وقتِ آخر چاہتا ہوں اور دُنیا میں جیوں ــــ اِتنے دن رہنے پہ بھی رہنے کا ارماں رہ گیا

لوگ کہتے تھے کہ بسمل ہے نہایت حق پرست
بُت کدے میں کس طرح ایسا مسلماں رہ گیا
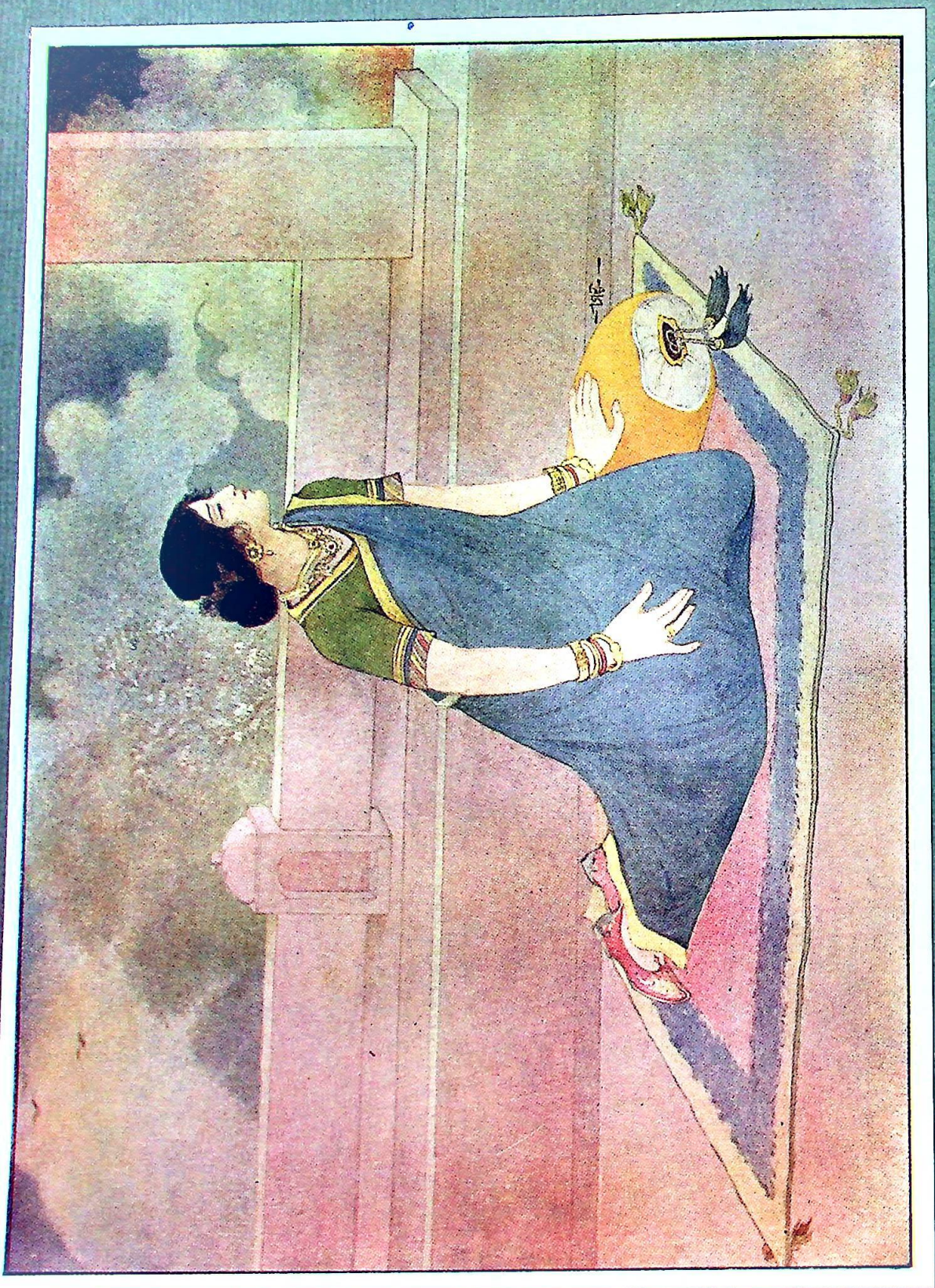
مشاعرہ مصری باغ الہ آباد ۲۲ نومبر ۱۹۲۶ء

جھگڑا لگا یا اُس نے سوال وجواب کا　　عالم بدل گیا دلِ ناکامیاب کا
اب پھر رہے ہو ساری خدائی میں بے نقاب　　کیوں طور پر خیال تھا تم کو حجاب کا
اُمّید پر جو یاس مری غالب آ گئی　　نقشہ بدل گیا دلِ پُر اضطراب کا
تارے کریں گے کیا رُخِ روشن سے سرکشی　　جُھکتا ہے تیرے سامنے سر آفتاب کا
ساقی مناؤں میں بھی ترے مے کدے کی خیر　　مل جائے مجھ کو ایک پیالہ شراب کا
اب تک ہیں میری خاک کے ذرّے بھی رقص میں　　مر کر اثر یہ ہے دلِ پُر اضطراب کا

مشہور ہوں جہان میں بسمل کے نام سے
کشتہ ہوں میں کسی نگہ برق تاب کا

مشاعرہ راجہ پور الہ آباد ۳ر فروری ۱۹۲۷ء

قابلِ شرح مرا حالِ دلِ زار نہ تھا　　سُننے والے تو بہت تھے کوئی غم خوار نہ تھا
اب وہ جینے کے لئے سوچ رہا ہے تدبیر　　اپنے ہاتھوں جسے مرنا کبھی دُشوار نہ تھا
مجھ سے پوچھو تو قضا اُس کی ہے موت اُس کی ہے　　دوشِ احباب پہ جو مر کے گراں بار نہ تھا
پھنستے تھے باغ میں آ آ کر اُنھیں اہلِ جنوں　　آشیاں کا مرے تنکا کوئی بے کار نہ تھا
یہ ہمیں نے تو محبّت کی نکالیں رسمیں　　آپ پر مرنے کو پہلے کوئی تیار نہ تھا
دامِ صیّاد میں آزاد رہا شکوۂ غم　　میں گرفتار تھا لیکن یہ گرفتار نہ تھا

اب اُنھیں سامنے آنے میں ہے عذر اے بسمل
ملنے جُلنے سے جنھیں پیشتر انکار نہ تھا

مشاعرہ کرسچن کالج الٰہ آباد ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۳ء

ہے تعجب قتل گہ میں کیوں مرا سر رہ گیا
اُن کا بازو رہ گیا اور اُن کا خنجر رہ گیا

جب ہوا مضطر تو میں تسکینِ خاطر کے لئے
نام چپکے سے کسی کا دل میں لے کر رہ گیا

چومتے ہیں بار بار آ کر جسے اہلِ حرم
کیا کوئی کعبے میں بُت خانے کا پتھر رہ گیا

رات بھر تو ہچکیاں لیتا رہا بیمارِ غم
صبح ہونی تھی کہ اک کروٹ بدل کر رہ گیا

رفتہ رفتہ مٹ گئی گو ناخنِ غم کی خراش
حشر تک قائم مگر اک داغ دل پر رہ گیا

جسمِ لاغر کی بدولت جان اپنی بچ گئی
موت نے جانا یہ کوئی تارِ بستر رہ گیا

جب اُٹھا کوئی بگولہ خاک اُڑانے کے لئے
تیرے دیوانے کا نقشہ اس میں کھنچ کر رہ گیا

پی گیا پینے کو سیروں جسمِ بسمل کا لہو
کیا غضب ہے تشنہ لب اس پر بھی خنجر رہ گیا

مشاعرہ گوالیار ۱۱ر دسمبر ۱۹۲۴ء

کس کس کو دلِ زار میں مہماں نہیں دیکھا
ارماں نہیں دیکھا ہے کہ پیکاں نہیں دیکھا

تلوؤں میں جو چبھ کر نہ کلیجے میں چبھا ہو
ایسا تو کوئی خارِ بیاباں نہیں دیکھا

اے حضرتِ موسیٰ تمھیں تھی حسرتِ دیدار
کیوں گر پڑے کیا جلوۂ جاناں نہیں دیکھا

آئینے میں لڑتے ہی رہے پرتوِ رُخ سے
حیراں ہوں کہ میں نے اُنھیں حیراں نہیں دیکھا

وحشی کا گریباں ہو تو اُن کو نظر آئے
وہ کہتے ہیں وحشی کا گریباں نہیں دیکھا

روشن ہے مگر شمع کا وہ سوز کہاں ہے
ہم نے کبھی مہتاب کو گریاں نہیں دیکھا

اُس مصحفِ رُخ کا ہے تصوّر تمھیں بسمل
ہندو کو کبھی حافظِ قرآں نہیں دیکھا

مشاعرہ کانپور کرائسٹ چرچ کالج ۱۶ر جنوری ۱۹۲۶ء

تلاشِ یار میں مجبور سا مجبور ہو جانا
وہ میرا مرکزِ اصلی سے کوسوں دُور ہو جانا

مرا گھر طُور ہے تو واسطہ کیوں طُور سے رکھوں
وہ جائے جس کو اِتنی دُور تک منظور ہو جانا

دمِ آخر اُٹھا دینا اُنھیں مَیں یہ خبر کیا تھی
نہ دیکھا جائے گا اُن سے مرا مجبور ہو جانا

جو سچ پوچھو وفا کے نام کو بدنام کرتا ہے
زمانے میں تمھارا بے وفا مشہور ہو جانا

وہ اُٹھنا میری میت کا گذرنا اُن کے کوچے سے
وہ اُن کا سر جُھکا کر ساتھ تھوڑی دُور ہو جانا

نظر مَیں کیوں نہ رکھوں منظرِ صحرائے اُلفت پر
ہر اک ذرّے کو آتا ہے چراغِ طُور ہو جانا

کوئی کُچھ بھی کہے چُھپنا تمھارا غیر ممکن ہے
جو تم سے ہو سکے میری نظر سے دُور ہو جانا

تڑپنا ہی مری تقدیر میں لکھا ہے اے بسملؔ
تعجّب کیا اسی کی وجہ سے مشہور ہو جانا

۱۳ر جنوری ۱۹۲۱ء

حسب فرمائش چودھری اجل بہاری لال صاحب تعلقدار خیر آباد (سیتا پور)

بہ قید یک قافیہ

کیا کہیں شیرازۂ ہستی جو برہم ہو گیا
بعد مر جانے کے اپنا اور عالم ہو گیا

شکوۂ غم پر مزاجِ یار برہم ہو گیا
پہلے عالم اور تھا اب اور عالم ہو گیا

ساری دُنیا کو خبر سارے زمانے کو خبر
آپ کا عالم بہت مشہورِ عالم ہو گیا

اور اس کو کیا کہیں یہ بھی خدا کی شان ہے
بیٹھ کر پردے میں تو مشہورِ عالم ہو گیا

مجھ کو تیری یاد ہے تجھ کو عدو کی یاد ہے
میرے عالم کی طرح تیرا بھی عالم ہو گیا

جان دے کر پائی مَیں نے فکرِ دُنیا سے نجات
اور عالم میں پہنچ کر اور عالم ہو گیا

دیکھ کر قاتل کی صورت بڑھ گیا سیروں لہو
اور ہی کچھ حضرتِ بسملؔ کا عالم ہو گیا

مشاعرہ الہ آباد ۲۷ جنوری ۱۹۳۲ء

جو کھل جائے گا رازِ عشق و اُلفت اہلِ محفل پر
تو حسرت سب کو آئے گی مرے حسرت بھرے دل پر

نکل کر اشک آنکھوں سے رہیں گے میرے دامن میں
بھٹک کر یہ مسافر خود پہنچ جائیں گے منزل پر

نہیں کچھ اعتبارِ زندگی بحرِ حوادث میں
یہ کشتی ڈوب جائے گی مجھے پہنچا کے ساحل پر

قفس میں دیکھ کر مجھ کو طبیعت اُس کی بھر آئی
نہیں معلوم کیا گذری مرے صیّاد کے دل پر

طریقِ عشق میں کیوں مرکزِ اصلی کو ہم بھولیں
قدم اپنے ہیں رستے پر نظر اپنی ہے منزل پر

یہ منظر بحرِ اُلفت کا ابھی تم نے نہیں دیکھا
لگی رہتی ہیں آنکھیں ڈوبنے والوں کی ساحل پر

جہاں جاتے ہو اے بسمل جما دیتے ہو رنگ اپنا
تمھارا نام رہتا ہے زبانِ اہلِ محفل پر

مشاعرہ کالیستھ پاٹھ شالہ کالج الہ آباد ۲۹ نومبر ۱۹۲۵ء

کبھی پہنچیں گے منزل پر یہاں ہو کر وہاں ہو کر
کہ پیچھے کارواں کے ہم ہیں گردِ کارواں ہو کر

رہے دُنیا میں ہم پامالِ جورِ آسماں ہو کر
جیے تو نیم جاں ہو کر مرے تو بے نشاں ہو کر

یہ دُنیا جانتی ہے دل کی دُنیا اور دُنیا ہے
زمانے بھر کے اِس میں راز رہتے ہیں نہاں ہو کر

نہاں ہو کر تمھارا حُسن تو یہ قہر ڈھاتا ہے
خدا جانے کرے گا کیا زمانے میں عیاں ہو کر

ملا کرتا ہے پستی ہی سے زینہ بامِ رفعت کا
کنوے سے نکلے تو یوسف متاعِ کارواں ہو کر

ہماری خاک اُڑ کر آسماں سے بات کرتی ہے
سبب یہ ہے رہے ہیں ہم زمیں پر آسماں ہو کر

سمجھ ہی میں نہیں آتا نظامِ عالمِ ہستی
خدا کی شان آ نکلے کہاں سے ہم کہاں ہو کر

اِسی سے سب نے جانا یہ کسی پر جان دیتا ہے
ہوئی مشہورِ عالم آہ میری داستاں ہو کر

یہ میری بُت پرستی اک طرح کی حق پرستی ہے
خدا کا حکم ہے بسمل رہو محوِ بُتاں ہو کر

مشاعرہ ہندو بورڈنگ ہاؤس الہ آباد ۲۴ نومبر ۱۹۲۳ء

یہ شگوفے رات دن کھلتے ہیں کس بُنیاد پر
مجھ کو حیرت ہے بنائے گلشنِ ایجاد پر

یہ زباں بندی بھی اک بے داد ہے بے داد پر
مُہر ظالم نے لگا دی کیوں لبِ فریاد پر

برق گرنے کو گری لیکن ذرا ہٹ کر گری
آنچ تک آنے نہ پائی خانۂ صیاد پر

بُت کدے کی نیو زاہد کس قدر مضبوط تھی
آج تک کعبہ بھی ہے قائم اُسی بُنیاد پر

اب وہی دیباچۂ اُلفت میں ہے عنوانِ دل
تھا جو اک قطرہ لہو کا نشترِ فصّاد پر

مر گیا میں راہ اُس کی دیکھ کر وعدے کی شب
بھولنے والا پشیماں اب ہے اپنی یاد پر

ہر کسی کے نام میں تخصیص ہونی چاہیئے
کیوں نہ اے بسملؔ مٹیں ہم خنجرِ جلّاد پر

مشاعرہ الہ آباد ۱۷ فروری ۱۹۲۴ء

دیوان رادھے ناتھ صاحب کول گلشن لاہوری کے اہتمام سے یہ مشاعرہ ہوا تھا اور اس کے صدر سر تیج بہادر سپرو تھے

پلٹ آتے ہیں نالے میرے مایوسِ اثر ہو کر
یہاں ہو کر وہاں ہو کر اِدھر ہو کر اُدھر ہو کر

جو نکلے گی مری فریاد دل سے پُر اثر ہو کر
زمین و آسماں رہ جائیں گے زیر و زبر ہو کر

مریضِ غم کی بالیں سے تمہارا اُٹھ کے چل دینا
ہُوا مشہورِ عالم یہ بھی مرنے کی خبر ہو کر

ہمیں اے شوقِ مرگ اب اس کو چل کر آزمانا ہے
خدا کے گھر پہنچ جاتے ہیں کیوں کر اُن کے گھر ہو کر

وہ غفلت ہی مری اچھی تھی میری ہوشیاری سے
بلا میں پھنس گیا میں بے خبر سے باخبر ہو کر

اِدھر ہو کر تو مجھ پر دل نے لاکھوں آفتیں ڈھائیں
خدا جانے کرے کیا کیا ستم اب یہ اُدھر ہو کر

یہ سمجھو داغِ حسرت کیا ہے نقشِ آرزو کیا ہے
ہمارے دل کی دُنیا میں نہ بیٹھو بے خبر ہو کر

یہ میرا دل ہے اے صیاد یہ میرا کلیجہ ہے
کہ دیتا ہوں دعائیں تجھ کو میں بے بال و پر ہو کر

تڑپنا لوٹنا ہی رات دن کا تیرے ہاتھ آیا
بھلا کیا تجھ کو بسملؔ بسملِ تیغِ نظر ہو کر

مشاعرہ الہ آباد ۲۲ رجولائی ۱۹۲۲ء

وقتِ اخیر موت کے آثار دیکھ کر　　　احباب رو دئے رُخِ بیمار دیکھ کر

دُہراتے ہیں وہ سب سے فسانہ کلیم کا　　　دُنیا کو اپنا طالبِ دیدار دیکھ کر

اِک مُشتِ پر کے حق میں اِسے کتنی لاگ تھی　　　صیّاد خوش ہے مُجھ کو گرفتار دیکھ کر

دُنیا کے بے قصور قیامت میں بار بار　　　پچھتا رہے ہیں شانِ گُنہ گار دیکھ کر

احباب دل کو تھام کے بالیں سے اُٹھ گئے　　　بیٹھا گیا نہ صورتِ بیمار دیکھ کر

زندانِ ذوق و شوق میں اُن کا اسیرِ عشق　　　چُپ چاپ ہو گیا در و دیوار دیکھ کر

بسملؔ بھی قتل گاہ میں دم بھر نہ رُک سکے
چلتی ہوئی کسی کی وہ تلوار دیکھ کر

حسب فرمائش عزیزی بابو ہریش چندر رضیاؔ دیوانند پوری بی۔ اے، ایل ایل۔ بی ۷ راگست ۱۹۲۶ء

لاکھ چُھپائیے تو کیا چُھپ نہ سکے گا رازِ عشق　　　بول اُٹھے گا خود بہ خود چھیڑے بغیر سازِ عشق

فیصلہ دیکھیں کیا کرے حشر میں کارسازِ عشق　　　ایک طرف ہے نازِ حُسن ایک طرف نیازِ عشق

سجدہ کو سر جُھکا رہا حشر کے آگے روز و شب　　　اچھی طرح نہ ہو سکی پھر بھی ادا نمازِ عشق

جلوۂ سرمدی نے لیں اُس کی بلائیں بار بار　　　جان سے جب گذر گیا سرمدِ پاک بازِ عشق

حُسن کی سب کرامتیں پیشِ نظر ہوں خود بہ خود　　　کعبۂ دل میں ہم پڑھیں دل سے اگر نمازِ عشق

غور سے اہلِ دل سُنیں بیٹھ کے واقعاتِ حُسن　　　چھیڑنے جا رہا ہوں میں نغمۂ سوز و سازِ عشق

حُسنِ بُتاں پہ ہے فدا بسملِؔ حق پرست بھی
پڑھتا ہے بُت کدے میں اب شوق سے وہ نمازِ عشق

طبع زاد - ۲۳ جون ۱۹۲۷ء

کیا ہے کس کے دل میں حسرت کیا ہے کس کے دل کا رنگ
دیکھتا ہوں دور سے میں بھی تری محفل کا رنگ

مُجھ سے کوئے عشق کے حالات پوچھ اے ہم نشیں
رہروِ اُلفت کو ہے معلوم اس منزل کا رنگ

خون رو دیتا ہے اکثر خونِ حسرت دیکھ کر
پوچھتے کیا ہو تم اپنے غم زدے کے دل کا رنگ

آج صورت اور کچھ ہے کل تھی صورت اور کچھ
دیکھتے ہی دیکھتے بدلا تری محفل کا رنگ

اِن میں جو پردہ ہے اُس کو بس اُسی سے پوچھئے
قیس ہی کچھ جانتا ہے ناقہ و محمل کا رنگ

دیکھتے ہیں کس لئے جُھک جُھک کے ساتوں آسماں
کیا بدلتا ہے زمینِ کوچۂ قاتل کا رنگ

ایک تو پڑھنا قیامت دوسرے اچھا کلام
غیر ممکن ہے کہ اُکھڑے حضرتِ بسمل کا رنگ

مشاعرہ گوالیار - ۲۷ ستمبر ۱۹۲۴ء

اِس کو دیں گے غم اُٹھانے کے لئے مشکل سے ہم
دل نہ ہو گا تو تمھیں چاہیں گے پھر کس دل سے ہم

وہ ہمیں اُٹھوا چُکے اب اُٹھ چُکے محفل سے ہم
آئے جس مُشکل سے جائیں گے اُسی مشکل سے ہم

دل نہیں ملتا جو دل سے تو یہ ملنا کچھ نہیں
آپ بھی اُس دل سے ملئے ملتے ہیں جس دل سے ہم

جادۂ اُلفت میں کیا کیا شوق نے چکّر دئے
تھی کہاں منزل نکل آئے کہاں منزل سے ہم

دل نہیں تو اب ہے دل کی آرزو دل کا خیال
پھنس گئے دو مشکلوں میں چھُٹ کر اک مشکل سے ہم

ہے تعجب خیز جوشِ بحرِ غم کا مدّ و جزر
اتنے ہیں نزدیک جتنی دور ہیں ساحل سے ہم

آپ کی محفل سے اُٹھنے کا نتیجہ یہ ہوا
تنگ آ کر اُٹھ گئے دُنیا کی بھی محفل سے ہم

تیری نظروں میں نہیں صیّاد قدرِ آشیاں
کر سکے ہیں جمع یہ تنکے بڑی مُشکل سے ہم

جوش میں آ کر کوئی قاتل یہ کہہ دے تو سہی
کچھ بھی ہو لیکن ملیں گے حضرتِ بسمل سے ہم

مشاعرہ آل انڈیا نیشنل کانگریس گیا ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۲ء

جو کہیں وہ کر دکھائیں اس کے ہم عامل نہیں — دو زبانیں کیوں نہیں کس واسطے دو دل نہیں

پھیر لوں گا میں چھری گردن پر اپنے ہاتھ سے — مرنے والے کے لئے مرنا کوئی مشکل نہیں

کشتیِ دل غرق ہو جائے نہ اے گردابِ غم — ہر طرف دریا ہی دریا ہے کہیں ساحل نہیں

دل سے نکلے لب تک آئے لب سے پہنچے عرش تک — دل ہی دل میں جو رہے گھُٹ کر وہ آہِ دل نہیں

روکتی ہے اس ارادے سے مجھے میری اُمید — مَیں سمجھتا تھا کہ مرجانا کوئی مُشکل نہیں

ہر نفس کہتا ہے تھک تھک کر یہ مجھ سے ہر نفس — رہ روِ گُم کردہ منزل کی کوئی منزل نہیں

کیا کروں اے خنجرِ غم کیا کروں اے تیرِ عشق — ہیں تو دو پہلو مگر دونوں میں اک اک دل نہیں

آس تم نے توڑ دی اپنے مریضِ عشق کی — اُس کے مُنہ پر کیوں کہا جینے کے یہ قابل نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ وہ قاتل بڑا بے درد ہے — اُس کو بھی بسمل نہ مَیں کر دوں تو پھر بسمل نہیں

مشاعرہ الہ آباد ۲۴ر مارچ ۱۹۲۳ء

یہ مشاعرہ ڈاکٹر کیلاش ناتھ صاحب کاٹجو کے اہتمام سے ہوا تھا۔ پنڈت برج نراین صاحب چکبست اور منشی نوبت رائے صاحب نظر لکھنوی سے اسی مشاعرہ میں بسمل صاحب سے تعارف ہوا تھا

اس طرح باغِ جہاں میں کوئی برباد نہیں — ایک تنکا بھی نشیمن کا ہمیں یاد نہیں

پھول دامن میں اگر ہیں تو ہیں کانٹے لاکھوں — سَیر کرنے کی جگہ گلشنِ ایجاد نہیں

اس قدر ہوش ہے چمکی تھی کہیں برقِ جمال — کس کا جلوہ نظر آیا یہ ہمیں یاد نہیں

یاس ہی یاس مرے دل میں نظر آتی ہے — اس طرح گھر یہ ہے آباد کہ آباد نہیں

وہ اگر میری وفا بھول گئے بھول گئے — کیا ستم ہے اُنھیں اپنے بھی ستم یاد نہیں

ہاں ذرا پھر تو کہو پھر تو کہو پھر تو کہو — ہم ستم گر ستم آرا ستم ایجاد نہیں

محو ایسا تھا تری یاد میں مرنے والا — رُوح کب جسم سے نکلی اُسے کچھ یاد نہیں

عرصۂ حشر میں کیا اپنی طبیعت بہلے — سب ہیں موجود وہی بانیِ بیداد نہیں

مَیں اسیری میں بھی خاموش اسی خوف سے ہوں — میرے نالے سُنے ایسا دلِ صیاد نہیں

داد اتنی تمھیں کیوں اہلِ سخن دیتے ہیں — تم تو اے حضرتِ بسمل کوئی اُستاد نہیں

رسالہ چمن امرتسر کے سالنامہ کے لئے یہ غزل کہی گئی تھی ۲۴ ر دسمبر ۱۹۳۰ء

بہ قیدِ یک قافیہ

بیٹھا ہوں چپ لگائے محبت کی راہ میں　　تصویر اُن کی پھرتی ہے میری نگاہ میں
اپنے پرائے ہو گئے اُلفت کی راہ میں　　دُنیا بدل بدل گئی اپنی نگاہ میں
رکھتا ہوں ڈر کے پانوں محبت کی راہ میں　　ایک ایک پیچ و خم ہیں ہماری نگاہ میں
گردن پہ تیغ پھر گئی دل پر چھُری چلی　　دُہرا اثر تھا اک تری ترچھی نگاہ میں
رہتا ہے دل کے سامنے عالم خیال کا　　دُنیائے حُسن پھرتی ہے میری نگاہ میں
آئینہ دیکھتے ہو جو تن تن کے بار بار　　دیکھو سما نہ جاؤ خود اپنی نگاہ میں
وہ شاد کیا ہو وادیِ ایمن کو دیکھ کر　　ہر ذرہ برقِ طُور ہے جس کی نگاہ میں
اب تک بہت غرور ہے اب تک بہت ہے ناز　　دو دن رہا تھا کوئی تمہاری نگاہ میں
تم کیا سما گئے ہو کہ ہم نے سمجھ لیا　　دُنیا سما گئی ہے ہماری نگاہ میں

بسملؔ ہو کیا اُمیدِ کرم خود پسند سے
اچھا نہیں کوئی بھی کسی کی نگاہ میں

مشاعرہ الہ آباد (مسلم ہوسٹل) ۱۶ ر نومبر ۱۹۲۸ء

کھُل گئیں سب حقیقتیں چشمِ نگاہِ ناز میں　　ٹھوکریں کھائیں گے نہ ہم چل کے رہِ مجاز میں
نیند نہ آئی رات بھر اُن کو حریمِ ناز میں　　کس نے اثر یہ بھر دیا نالۂ دل گداز میں
لُطفِ چمن سمائے کیا دیدۂ امتیاز میں　　عُمر مری بسر ہوئی وحشتِ جنوں نواز میں
زُلفیں کھُلی ہیں دوش پر پیشِ نظر ہے آئینہ　　قابلِ دید حال ہے اُن کا حریمِ ناز میں
کوئی تو خاص رمز ہے آتا ہے دوڑ دوڑ کر　　سر بہ سجود غزنوی بارگہِ ایاز میں
ہم ہوئے جامِ عشق سے مستِ شراب بے خودی　　ضُعف یکایک آگیا قوتِ امتیاز میں
زلفِ رسائے یار کو دیکھ کے ہو گیا یقیں　　ہو گی کمی نہ بال بھر میری شبِ دراز میں
آہ کرے فغاں کرے نالہ کرے گلہ کرے　　دم ہی نہیں اب اس قدر بسملِ تیغِ ناز میں

مشاعرہ الہ آباد ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۳ء

مُشتاق ہم بھی جلوۂ کون و مکاں کے ہیں
پردے ذرا اُٹھاؤ یہ پردے کہاں کے ہیں

اِس کی خبر نہیں کہ ارادے کہاں کے ہیں
ہم ساتھ ساتھ تَوسنِ عُمرِ رواں کے ہیں

بجلی کے جَور ہیں کبھی بادِ خزاں کے ہیں
بدخواہ لاکھوں ایک مرے آشیاں کے ہیں

بنتے ہیں پھول صُبح کو تو شام کو چراغ
آنسو یہ میری قبر پہ کس نوحہ خواں کے ہیں

اَے رہ روانِ وادیِ غُربت رُکے رہو
لے لو ہمیں بھی ہم بھی اُسی کارواں کے ہیں

ممکن نہیں کہ جمع نہ ہوں وہ بہار میں
تنکے اِدھر اُدھر جو مرے آشیاں کے ہیں

اے ہم نشیں جو نزع میں آتی ہیں ہچکیاں
معلوم ہے تجھے یہ بُلاوے کہاں کے ہیں

بسمؔل کِھلائیں باغِ سخن میں نہ پھول کیوں
ہم سلسلے میں بُلبلِ ہندوستاں کے ہیں

مشاعرہ الہ آباد ۱۱ دسمبر ۱۹۲۴ء

وہی اب پھول بن بن کر نکلتے ہیں گلستاں میں
ہوئے تھے دفن جتنے خوب رو شہرِ خموشاں میں

جنون انگیز اب کے وہ بہار آئی گلستاں میں
کہ وحشی توڑتے ہیں پاؤں کی زنجیر زنداں میں

کفن بھی ساتھ رکھنا دشت پیمائی میں لازم ہے
خدا جانے ہماری موت آئے کس بیاباں میں

کہوں کس جی سے میں اے چارہ گر اس کے مٹانے کو
خلش ہے جو رگِ دل میں کھٹک ہے جو رگِ جاں میں

اکیلا ہوں مگر پھر بھی اکیلا میں نہیں رہتا
کسی کی یاد میرے ساتھ پھرتی ہے بیاباں میں

فرشتے ہو گئے حیران ترتیبِ عناصر پر
کسی نے روح پھونکی ایسی اجزائے پریشاں میں

مجھے مجنوں کی بربادی کا عالم یاد آتا ہے
بگولا جب کوئی چکّر لگاتا ہے بیاباں میں

مجھے ہے واسطہ دیر و حرم دونوں سے اے بسمؔل
کہ میں ہندو ہوں ہندو میں مسلماں ہوں مسلماں میں

مشاعرہ کلیانی دیوی کلب الہ آباد ۳۱ جنوری ۱۹۲۶ء

بہ قیدِ یک قافیہ

وفا میں ہم ہیں وہ کامل ہیں ظلم ڈھانے میں
یہ بات پھیل گئی ہر طرف زمانے میں

فضول صرف کیا وقت آنے جانے میں
ہماری سیر نہ پوری ہوئی زمانے میں

ابھی تو میری وفاؤں کی قدر خاک نہیں
زمانہ یاد کرے گا کسی زمانے میں

یہ کیا غضب ہے کہیں وہ نظر نہیں آتا
نگاہیں ڈھونڈھ رہی ہیں اُسے زمانے میں

کسی کو قتل کسی کو ہلاک کر ڈالا
وہ چاہتے ہیں کہ ہم رہیں زمانے میں

فنا کے بعد یہ عشق و وفا کی قدر ہوئی
پھرائی جاتی ہے میّت مری زمانے میں

زمانے بھر میں تو ہے اُس کے حُسن کا چرچا
کسی نے شکل نہ دیکھی مگر زمانے میں

کرو جو غور تو دل ہی ذلیل و خوار نہیں
نگاہِ ناز بھی بدنام ہے زمانے میں

نظر نہ آؤ کسی کو تو ہے نظر کا قصور
ہزار شکل سے ظاہر ہو تم زمانے میں

مری نگاہ سے دیکھیں وہ تیری آنکھوں کو
دکھا رہی ہیں جو آنکھیں مجھے زمانے میں

ہزار بار جئے ہم ہزار بار مرے
یہ زندگی تھی کوئی زندگی زمانے میں

خود اُن کو چاہنے والوں کی آرزو ہوگی
اگر بدل گئی دُنیا کسی زمانے میں

کسی کو ناز کسی کو ہے رشک اے بسملؔ
کہ اتنے ہو گئے مشہور ہم زمانے میں

مشاعرہ پٹنہ (درگاہ شاہ ارزاں صاحب) ۲۹ مارچ ۱۹۲۴ء

اُن سے کہہ دو کہ علاجِ دلِ شیدا نہ کریں
یہی اچھا ہے کہ بیمار کو اچھا نہ کریں

کیا کہا پھر تو کہو ہم کوئی شکوا نہ کریں
چُپ رہیں ظُلم سہیں ظُلم کا چرچا نہ کریں

یہ تماشا تو کریں رُخ سے اُٹھا دیں وہ نقاب
ایک عالَم کو مگر محوِ تماشا نہ کریں

وقتِ آخر تو نکل جائے تمنّا میری
وہ نہ ایسے میں بھی آئیں کہیں ایسا نہ کریں

انتہا ہو گئی آزار دہی کی صیّاد
ہم تصوّر میں بھی گُلزار کو دیکھا نہ کریں

روز وہ کہتے ہیں آج آئیں گے کل آئیں گے
ایسے وعدے سے تو بہتر ہے کہ وعدا نہ کریں

خود نمائی اُنھیں غیروں میں لئے پھرتی ہے
ہم تو جب جانیں کہ ہم سے بھی وہ پردا نہ کریں

تیغ رُک جاتی ہے ناوک بھی بہک جاتا ہے
کوئی بسملؔ کو یہ سمجھا دے کہ تڑپا نہ کریں

مشاعرہ ہندو یونیورسٹی بنارس ۱۴؍ جنوری ۱۹۲۵ء

اے جنوں ٹھہروں گا میں کیا خانۂ زنجیر میں
پانو میں چکّر ہے گردش ہے مری تقدیر میں

اور دریائے محبت کا تلاطم بڑھ گیا
جب ملا خونِ سرِ فرہاد جوئے شیر میں

تُم ہو جب تقدیر میں تقدیر بھی تقدیر ہے
تم نہیں تقدیر میں تو کچھ نہیں تقدیر میں

کُچھ کہے بھی کُچھ سُنے بھی کُچھ ملے پھر کچھ کھنچے
اتنی باتیں جب نہیں تو لُطف کیا تصویر میں

زندگی کا نام آیا بعد کو روزِ ازل
سب سے پہلے موت ہی لکھی گئی تقدیر میں

سلسلہ زُلفِ مُسلسل کا تمھاری بڑھ گیا
ہم تو کیا جکڑی گئی دُنیا اِسی زنجیر میں

پھوڑ کر سر ایک تُو نے کیوں لہو پانی کیا
ڈوب مرنا تھا تجھے فرہاد جوئے شیر میں

جس نے جل مرنا پتنگے کے مقدر میں لکھا
اُس نے رونا بھی تو لکھا شمع کی تقدیر میں

آپ ہی سے تو زمانے بھر کے ہیں نقش و نگار
آپ کیوں بیٹھے ہیں چھپ کر پردۂ تصویر میں

غم نہیں مرنے کا مٹّی تو ٹھکانے لگ گئی
لاش ہے فرہاد کی آغوشِ جوئے شیر میں

سب کی قسمت میں لکھی ہے موت اپنے وقت پر
اور ہے بے وقت مرجانا مری تقدیر میں

نام اُس کا دل ہے دل کہتے ہیں اُس کو اہلِ دل
خون کا قطرہ جو ہے پیوستِ نوکِ تیر میں

آتا ہے پریاگ سے کاشی جو بسمل بار بار
لکھ گیا درشن بُتوں کا کیا تری تقدیر میں

حسب فرمایش عزیزی شاطر صاحب الہ آبادی ۷، ۲۰ ستمبر ۱۹۲۴ء

کوئی حالِ زار میں شامل نہیں — آج اپنا دل بھی اپنا دل نہیں
یہ کسی لائق کسی قابل نہیں — پہلے دل دل تھا مگر اب دل نہیں
اب مرا انصاف ہو ہی جائے گا — حشر ہے یہ آپ کی محفل نہیں
دھیان ہے دونوں کو اپنی بات کا — آج یا حسرت نہیں یا دل نہیں
پہلے اپنے کو تو ہم کر لیں تلاش — اُس کا مل جانا کوئی مشکل نہیں
ایک دُنیا کہتی ہے قاتل تمہیں — اور تم کہتے ہو ہم قاتل نہیں
ہو رہی ہے عالمِ بالا کی سیر — عرشِ اعظم ہے ہمارا دل نہیں
رُوح کا جانا بہت آسان ہے — مَوت کا آنا کوئی مشکل نہیں
دیکھتے ہیں آپ لاکھوں داغِ عشق — ہے یہ گُل دستہ ہمارا دل نہیں
موت ہی کے غم میں ہم مرتے رہیں — زندگی کا اور کچھ حاصل نہیں
تیرے گھر میں تیری بزمِ ناز میں — اور سب ہیں حضرتِ بسمل نہیں

حسب فرمائش عزیزی بابو پرتاب نرائن وفا ایم۔ اے شاہ جہاں پوری۔ ۱۸/ اگست ۱۹۲۶ء

دیکھ سنبھل سنبھل کے چل رہ گذرِ حیات میں — چُوک نہ جائے تُو کہیں مَوت ہے تیری گھات میں
فکرِ ثبات کیا کروں عالمِ بے ثبات میں — زیست کے ساتھ مَوت ہے پردہ کائنات میں
لُطفِ نشاط و عیش کیا آئے ہمیں حیات میں — رُوح ہماری قید ہے کشمکشِ نجات میں
کہہ دو قضا سے آئے اب کچھ نہیں کائنات میں — بیٹھ گیا ہوں تھک کے میں رہ گذرِ حیات میں
یہ بھی کرم ہے کیا کرم یہ بھی ستم ہے کیا ستم — کر گئے مجھ پہ وہ جفا پردۂ التفات میں
خاک اُڑانے سے ہُوا مجھ کو وفا کا تجربہ — دل کی ہے قدر ہر جگہ حُسن کی کائنات میں
نقش و نگارِ خلق پر اور بڑھا کچھ اضطراب — دیکھ کے صورتِ اجل آئینۂ حیات میں

بسملِ خنجرِ ادا آج تڑپ کے مر گیا
مَوت لگی ہوئی تھی کیا پہلے سے اپنی گھات میں

مشاعرہ کے۔ ڈی کلب الٰہ آباد ۲۷ فروری ۱۹۲۶ء

یہ مشاعرہ بابو ہریش چندر سری واستو ضیاؔ دیوانند پوری بی اے ایل ایل بی کے اہتمام سے ہوا تھا

بہ قیدِ یک قافیہ

یہ نہ پوچھو کون ہوں وہ خانماں برباد ہوں
خاک میں مل کر بھی مَیں دُنیا کو اب تک یاد ہوں

گو اسیرِ دام ہوں مَیں آشیاں برباد ہوں
ہم صفیرانِ چمن کو لیکن اب تک یاد ہوں

ایک مدت میں ملا تم سے بچھڑ کر اہلِ بزم
کس کو کس کو مَیں ہوں بھولا کس کو کس کو یاد ہوں

بھول جائے کس طرح لُطفِ نشاطِ زندگی
مجھ کو دُنیا یاد مَیں دُنیا کو اب تک یاد ہوں

صفحۂ آفاق میں ہستی مری کچھ بھی نہیں
ہوں جو مَیں حرفِ غلط تو کیا کسی کو یاد ہوں

زندگی تو بھول بیٹھی زندگی کا ذکر کیا
مَوت کو دیکھو کہ اک اک سانس پر میں یاد ہوں

چند ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے اپنے دل کے دے دِئے
کیا عجب ہَیں اس بہانے سے اب اُس کو یاد ہوں

گلشنِ عالم میں کوئی پنکھڑی بھولی نہیں
وہ گُلِ خوش رنگ ہوں ہر رنگ کو مَیں یاد ہوں

میرے ذرّاتِ پریشاں اُڑ رہے ہیں ہر طرف
ہو یہ صورت تو نہ میں دُنیا کو کیوں کر یاد ہوں

خیر یہ بھی ہے غنیمت خیر یہ بھی ہے کرم
بعد مر جانے کے مَیں قاتل کو بسملؔ یاد ہوں

مشاعرہ کرسچین کالج الہ آباد ۲۴ دسمبر ۱۹۲۴ء

یہ مشاعرہ بابو پرتاب نرائن صاحب وفاؔ ایم اے شاہ جہاں پوری کے اہتمام سے ہوا تھا

ارے صیاد اس پر غور کر اچھی طرح دل میں
نہ ہوتا آشیاں تو ہم نہ پھنستے آج مشکل میں

پھنسے گی روح زحمت میں پڑے گی جان مشکل میں
تمہارا تیرِ ناز اب کروٹیں لینے لگا دل میں

یہ کیا ہے بدگمانی میرے حالِ زار پر دل میں
جو تم رکھتے ہو مشکل میں تو میں رہتا ہوں مشکل میں

وہ آتے ہیں وہ جاتے ہیں عیاں ہو کر نہاں ہو کر
کبھی محفل سے خلوت میں کبھی خلوت سے محفل میں

دمِ آخر عجب عالم رہا بیمارِ اُلفت کا
تمہاری شکل آنکھوں میں تمہاری یاد تھی دل میں

ابھی مشہور ہر سو ہو رہی ہیں خوبیاں اس کی
کبھی دنیا نکالے گی ہزاروں عیب بسملؔ میں

طبع زاد - ۲۰ مارچ ۱۹۲۴ء

آزار و جفائے پیہم سے اُلفت میں جنھیں آرام نہیں
وہ جیتے ہیں لیکن اُن کو مرنے کے سوا کچھ کام نہیں

افلاک کی گردش سے دم بھر دُنیا میں ہمیں آرام نہیں
وہ دن نہیں وہ اب رات نہیں وہ صبح نہیں وہ شام نہیں

کیوں ہم نے محبت کی اُن سے دقت میں پھنسے زحمت میں پھنسے
آغاز ہی میں دل میں کہتا تھا اچھا اس کا انجام نہیں

اس کا بھی الم اُس کا بھی قلق یہ غم بھی ہمیں وہ غم بھی ہمیں
جینے کو غنیمت سمجھے تھے جینے میں مگر آرام نہیں

گلشن میں خزاں اب آپہنچی مے خانے میں جی کیوں کر بہلے
وہ رنگ نہیں وہ لطف نہیں وہ دور نہیں وہ جام نہیں

ہر سانس سے آتی ہے یہ صدا مرنے کے لئے تیار رہو
جینے سے نہیں کچھ دلچسپی جینے سے ہمیں کچھ کام نہیں

قاتل کو یہ سمجھا دے کوئی نالے سے فغاں سے شیون سے
بسمل نہ کروں میں اے بسملؔ تو بسمل میرا نام نہیں

---

۳۰ ستمبر ۱۹۲۸ء

حسب فرمائش بابو للت موہن ورما، وائس چیرمین میونسپل بورڈ مرزاپور

بھول کر آہ بھی کرتی مجھے منظور نہیں
یہ محبت کا طریقہ نہیں دستور نہیں

جان دے دوں جو محبت میں تو کچھ دور نہیں
مرنا منظور ہے جینا مجھے منظور نہیں

کیا کہا پھر کہو ملنا ہمیں منظور نہیں
دل سلامت ہے تو آہوں سے اثر دور نہیں

کل تو کہتے تھے کہ ہم ملنے پر آمادہ ہیں
آج کہتے ہو کہ ملنا ہمیں منظور نہیں

جلوۂ ہوش رُبا کے لئے آنکھیں بھی تو ہوں
دُور ہم جس کو ہیں سمجھے ہوئے وہ دُور نہیں

سب کو حسرت ہے کہ مل جائے حیاتِ ابدی
آپ کے ہاتھ سے مرنا کسے منظور نہیں

اشک پُرخوں مری آنکھوں سے بہا کرتے ہیں
پھر بھی تم کہتے ہو دل میں کوئی ناسور نہیں

کیا لگاؤں کسی قاتل سے دل اپنا بسمل
عشق و اُلفت میں تڑپنا مجھے منظور نہیں

مشاعرہ الہ آباد ۲۶ جون ۱۹۲۶ء

مٹ گیا داغِ جگر وہ رنگ و بوئے دل کہاں
بجھ گئی جب شمع تو پھر رونقِ محفل کہاں

ہم ترے گھر سے چلے آئے تو ظاہر ہو گیا
زندگی آساں کہاں ہے زندگی مشکل کہاں

جا رہا ہے وادیٔ اُلفت میں اطمینان سے
چلنے والے کو خیالِ دورئ منزل کہاں

اُن کا دل مل جائے میرے دل سے یہ دشوار ہے
آج تک ملتے ہوئے دیکھے کسی نے دل کہاں

مرنے والے کو جو حسرت جلد مر جانے کی ہو
پوچھ لے خود موت سے ہے کوچۂ قاتل کہاں

اُس میں دُنیا شاد و خرّم اِس میں عالم داد خواہ
حشر کی محفل کہاں اور آپ کی محفل کہاں

ڈوبنے والے کو اے بادِ مخالف کیا خبر
میں کہاں کشتی کہاں دریا کہاں ساحل کہاں

جادۂ اُلفت کی حد معلوم ہوتی ہی نہیں
دیکھئے آسان ہو یہ روز کی مشکل کہاں

دل سے اہلِ دل یہ کہتے ہیں مرا دل دیکھ کر
دل تو ہے پہلو میں سب کے لیکن ایسا دل کہاں

کل تو یوں بے خود نہ تھے بے دل نہ تھے بے دم نہ تھے
آج بسمل ہو گئے تم حضرتِ بسمل کہاں

مشاعرہ بھگوت باغ الہ آباد ۴ جون ۱۹۲۶ء

یہ مشاعرہ بسمل صاحب کے اہتمام سے ہوا تھا

مدت سے یہ سُنتے آتے ہیں وہ خانۂ دل میں رہتے ہیں
آجائیں نظر تو ہم جانیں کہنے کے لئے سب کہتے ہیں

نظروں کو نظر آتے جو نہیں تو ہم یہی دل سے کہتے ہیں
اس پردے میں بھی کچھ پردہ ہے وہ پردے میں کیوں رہتے ہیں

دُنیائے محبت میں دل سے مجبور بہت ہم رہتے ہیں
جو بات نہیں ہے کہنے کی وہ بات بھی اُن سے کہتے ہیں

کہتا ہے اُڑا کر خاک یہی سناٹا شہر خموشاں کا
جو دُنیا سے اُٹھ جاتے ہیں وہ اِس دُنیا میں رہتے ہیں

بے درد جفاجو بانیِ شر مکار فسوں گر عہد شکن
اے سُننے والے اُس کو سُن جو کہنے والے کہتے ہیں

دُنیا کے سمندر میں دیکھی تنکے کی طرح اپنی ہستی
ساحل پہ قدم رکھتے ہی نہیں ہر سمت یونہیں ہم بہتے ہیں

ہاتھوں کا اُٹھانا دوبھر ہے لب ہم کو ہلانا مشکل ہے
آنکھوں کے اشارے ہی سے فقط اب حالِ مصیبت کہتے ہیں

میں سامنے لانے کی کوشش کرتا ہوں تو ناحق کرتا ہوں
وہ روزِ ازل سے پردے میں کچھ سوچ سمجھ کر رہتے ہیں

مطلب یہ تمہارا ہے شاید درد اُٹھے تو روئے نہ کوئی
کیوں تم کو ہنسی آجاتی ہے آنسو جو کسی کے بہتے ہیں

اِس سوچ میں ہیں اِس چکر میں اِس فکر میں اِس دُنیا والے
وہ عالم کیسا عالم ہے جس عالم میں وہ رہتے ہیں

سو اچھوں کے تم اچھے ہو دُنیا کو تم اچھا کہتے ہو
دُنیا کی بُرائی ہم میں ہے دُنیا کو بُرا ہم کہتے ہیں

ہم روئیں کہاں تک اُلفت میں حد ہوتی ہے کوئی رونے کی
اب دل کے ٹکڑے آنکھوں سے بن بن کر آنسو بہتے ہیں

چھُپنے کو چھُپیں سو پردوں میں اس چھُپنے سے کیا ہوتا ہے
وہ ڈھونڈھ نکالیں گے اُن کو جو کھوج میں اُن کے رہتے ہیں

ہے نوحؔ سے نسبت بسملؔ کو طوفانِ سخن سے ڈر کیسا
ہر بزم میں غزلیں پڑھتے ہیں ہر بحر میں غزلیں کہتے ہیں

مشاعرہ بلرام پور ۱۹ر اکتوبر ۱۹۲۷ء

پھر چلے تیرِ نظر پھر وہ تماشا دیکھیں
کیا مرا دل ہے مرے دل کا کلیجا دیکھیں

وہ مرے نزع کے عالم کا تماشا دیکھیں
اب جو آئے ہیں تو جاتی ہوئی دُنیا دیکھیں

وقت کم اور زمانے میں ہزاروں منظر
پوچھتے ہیں نگہِ شوق سے کیا کیا دیکھیں

ہم نے مانا کہ بہت دیکھے ہیں مرنے والے
آپ مرنے کا ہمارے بھی تماشا دیکھیں

چھُپنے والے ہوسِ طالبِ دیدار تو دیکھ
یہ تمنّا تھی کہ ہم حسبِ تمنّا دیکھیں

آئینہ سامنے رکھ لیجئے کھُل جائے ابھی
آپ کیا چیز ہیں یہ آپ تماشا دیکھیں

گھر چھُٹا دیس چھُٹا اپنے سب احباب چھُٹے
گردشِ بخت سے دیکھیں ابھی کیا کیا دیکھیں

آتشِ عشق سے دل خاک ہوا جاتا ہے
گھر کسی کا جلے اور آپ تماشا دیکھیں

مَوت کی فکر میں بے مَوت مرا جاتا ہوں
مجھ کو دیکھیں وہ مرے دل کی تمنّا دیکھیں

ہم سے اَوروں سے زمانے میں سروکار نہیں
تُو دکھائے جو تماشا وہ تماشا دیکھیں

صدقے صدقے ترے اے جلوۂ جاناں صدقے
جو تجھے دیکھ لیں وہ مُنہ نہ کسی کا دیکھیں

ہے یقیں حضرتِ بسملؔ کی طرح ہوں بسمل
آپ اگر اُن کے تڑپنے کا تماشا دیکھیں

مشاعرہ کے۔ڈی کلب الہ آباد، ۲۰ فروری ۱۹۲۶ء

یہ مشاعرہ بابو ہریش چندر سری واستو ضیا دیوانند پوری بی۔اے، ایل ایل۔بی

کے اہتمام سے ہوا تھا

رنگ بے رنگی سے میں آوارہ و برباد ہوں
باغِ عالم میں ہوائے کوچۂ صیاد ہوں

بیٹھتے اُٹھتے ہمیشہ موردِ بے داد ہوں
اُن کا مطلب ہے یہی میں ہر طرح برباد ہوں

ہے قضا نزدیک مَیں کیا شاکیِ صیاد ہوں
رات بھر کی ہے اسیری صبح کو آزاد ہوں

ایک ایک ذرہ ہے میری خاک کا خورشیدِ عشق
حُسن والے یہ نہ سمجھیں ہستیِ برباد ہوں

روگ کی صورت سمائی ہے تنِ خاکی میں رُوح
سوچتا ہوں کس طرح اِس روگ سے آزاد ہوں

مجھ کو بے ڈھونڈھے کہاں دانہ ملا پانی ملا
کیا سمجھ کر تیرے گھر سے مَیں جُدا صیاد ہوں

میری بربادی پہ کوئی رونے والا بھی نہیں
بعد مر جانے کے میں ایسی جگہ آباد ہوں

خاک سمجھی ہے اگر دُنیا مُجھے سمجھی ہے خاک
خاک ہوں لیکن بنائے عالمِ ایجاد ہوں

ہر طرف پھرتا ہوں اپنے آشیاں کے واسطے
چار تنکوں کی ہوس میں کس قدر برباد ہوں

کہہ رہی ہے دل فریبی گلشنِ ایجاد کی
باغباں کے بھیس میں ہوں مَیں مگر صیاد ہوں

قافلے والے تو پہنچے منزلِ مقصود پر
مثلِ گردِ کارواں میں راہ میں برباد ہوں

نام پایا ہے نکل کر لعل نے کہسار سے
رنگ کہتا ہے کہ میں خونِ سرِ فرہاد ہوں

کہہ گیا بسمل سرِ محفل یہ اُستادی کی بات
نوح کا شاگرد ہوں لیکن بڑا اُستاد ہوں

مشاعرہ بنارس کوئنس کالج ۴ر نومبر ۱۹۲۶ء

تم کو یہ ہے اگر یقیں دل میں وہ جلوہ گر نہیں
ڈھونڈھا کرو تمام عمر ملنے کا عمر بھر نہیں

آئے نہ آئے بے خبر کیا تجھے یہ خبر نہیں
سانس کا اعتبار کیا شام ہے تو سحر نہیں

دیر ہو کعبہ ہو کہ دل کس میں وہ جلوہ گر نہیں
دیکھ سکوں مگر اُسے اِتنی مری نظر نہیں

کُنجِ قفس میں عندلیب مُضطرو بے کس و غریب
کہنے کو بال و پر تو ہیں اُڑنے کو بال و پر نہیں

دل میں بلا کا جوش ہے سر لیے سرفروش ہے
جینے کا ہوش ہے کہاں مرنے کا اُس کو ڈر نہیں

توڑ رہا ہے آج دم غم میں کوئی مریضِ غم
پھر بھی ہیں آپ بے خبر آپ کو کچھ خبر نہیں

جان گئے یہ مر کے ہم مُلکِ عدم تھا دو قدم
ختم ہو جلد جو سفر ایسا کوئی سفر نہیں

پردے میں آپ بیٹھ کر رکھتے ہیں ہر طرف نظر
اور زبان پر یہ ہے شوخ مری نظر نہیں

لب پہ ہے نعرۂ الست جھوم رہا ہے کوئی مست
چھائی ہے ایسی بے خودی اپنی اُسے خبر نہیں

اُف یہ مرا نصیبِ بد جا کے بنی کہاں لحد
سب کی ہے رہ گذر جہاں آپ کی رہ گذر نہیں

بات یہ تم نے سچ کہی بسملؔ بے ہُنر سہی
یہ بھی ہے اک بڑا ہُنر اُس میں کوئی ہُنر نہیں

مشاعرہ الہ آباد ۴، نومبر ۱۹۲۰ء

یہ مشاعرہ بسمل صاحب کے اہتمام سے ہوا تھا

ستاتی ہے فلک بن کر جہاں کی سرزمیں ہم کو
دلِ ناداں لئے جاتا ہے پھر دیکھو وہیں ہم کو

شرف بخشا فنا کے بعد اچھا اے زمیں ہم کو
ملا کر خاک میں تو نے کیا گردوں نشیں ہم کو

لئے جاتا ہے اُن کی زُلفِ پُر خم کے قریں ہم کو
دیا اللہ نے دل بھی تو مارِ آستیں ہم کو

عزیز و اقربا کو بعد مر جانے کے کیا سوجھی
کہ اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں پیوندِ زمیں ہم کو

نکلتے ہیں جو آنسو فوراً آنسو پونچھ لیتی ہے
یہ کیوں رونے نہیں دیتی کسی کی آستیں ہم کو

تمھاری جلوہ آرائی کا قائل اک زمانہ ہے
مگر یہ پردہ کیا ہے کیوں نظر آتے نہیں ہم کو

زمانہ مُفت میں چرخِ بریں کا نام لیتا ہے
جو سچ پوچھو تو مٹی میں ملاتی ہے زمیں ہم کو

کوئی صحرا نہیں چھوٹا جہاں مجنوں نہ پہنچا ہو
ملا کرتے ہیں اب تک اُس کے تارِ آستیں ہم کو

وہ جلوت ہے کہ جلوہ ہے کسی کا ذرّے ذرّے میں
یہ خلوت ہے نظر آتا نہیں کوئی کہیں ہم کو

جو دم بھر بھی نہ تنہا زندگی میں رہنے دیتے تھے
اکیلے سونپے جاتے ہیں وہ اب زیرِ زمیں ہم کو

گھُلایا دستِ وحشت کو بھی اُلفت کی حرارت نے
نظر آتی ہے خالی آستیں ہی آستیں ہم کو

سرِ مقتل تڑپنا دیکھ کر اے حضرتِ بسمل
وہ کیا کیا کہہ رہے ہیں آفریں پر آفریں ہم کو

مشاعرہ الٰہ آباد ۵، نومبر ۱۹۲۹ء

یہ مشاعرہ پنڈت رادھے ناتھ صاحب کول گلشنؔ لاہوری کے اہتمام سے ہوا تھا

رکھتا ہوں مَیں کفن میں جو تصویرِ یار کو
مطلب یہ ہے سجاؤں گا اپنے مزار کو

رہنے دو مٹنے والے کی اِس یادگار کو
تم کیوں مٹا رہے ہو کسی کے مزار کو

آپ اُس سے حالِ عارض و گیسو کا پوچھئے
دیکھا ہو جس نے گردشِ لیل و نہار کو

اونچا زمین سے ہو تو یہ آسماں بنے
سمجھے ہیں آپ کیا مرے مُشتِ غُبار کو

دستِ جنوں تو جامہ دری میں پھنسے رہے
تلوؤں سے بھی نکال سکے یہ نہ خار کو

صیّاد سے یہ کہتی ہے گھبرا کے عندلیب
کردے قفس میں بند ہوائے بہار کو

ایسا نہ ہو کہ تم بھی ہو بے چین دیکھ کر
دیکھو ذرا سنبھل کے دلِ بے قرار کو

مر کر اسی میں کُشتۂ حسرت ہوا ہے دفن
مٹی کا ڈھیر آپ نہ سمجھیں مزار کو

پہلو جلا جگر بھی جلا دل بھی جل گیا
دیکھے کوئی مرے نفسِ شُعلہ بار کو

عالم نظر میں ہے کسی زُلفِ دراز کا
میں طُول دے رہا ہوں شبِ انتظار کو

لایا بھی تو کوئی نہ جلی وہ تمام رات
کیا لاگ تھی مزار سے شمعِ مزار کو

پہلو میں جب سے یہ ہے مصیبت میں جان ہے
دے دوں کسے اُٹھا کے دلِ بے قرار کو

بسملؔ کے ہوتے قتل گہِ ناز میں وہ شوخ
بسمل کرے نہ اور کسی جاں نثار کو

مشاعرہ الہ آباد ۲۵ فروری ۱۹۲۴ء

چاہیئے پاسِ وفا کچھ آپ کے نخچیر کو　　　　دل میں تیر آئے تو کیوں دل سے نکالے تیر کو

حکم کیا دیتے ہو اپنے عاشقِ دل گیر کو　　　　دل میں رکھے یا کلیجے میں تمھارے تیر کو

تیرے دیوانے کی وحشت کھل گئی ایک ایک پر　　　　اُس نے جُنبش دی جب اپنے پانو کی زنجیر کو

یہ مرے دل میں کسی پہلو ٹھہرتا ہی نہ تھا　　　　مَیں نے دم دے دے کے رکھا ہے تمھارے تیر کو

مَیں رہا دُنیا میں جب تک دل شکستہ ہی رہا　　　　کوئی دیکھے تو مری پھوٹی ہوئی تقدیر کو

اِس کا کھنچنا اِس کے کھنچنے کی ادائیں دیکھ کر　　　　ایک دُنیا مول لیتی ہے تری تصویر کو

ہے اگر بسملؔ تمھارا نام تو یہ چاہیئے
سر پہ روکو تیغ کو دل میں جگہ دو تیر کو

مشاعرہ راجہ پور الہ آباد ۱۳ فروری ۱۹۱۹ء

بہ قید یک قافیہ

کام آئی سخت جانی عاشقِ ناشاد کی　　　　ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی چل کر چھری جلّاد کی

ہے یہی پہچان اُس کے کُشتۂ بے داد کی　　　　رکھی ہو گی قبر پر کوئی چھری جلّاد کی

رکھ دیا سر مَیں نے بڑھ کر خود ہی اُس کی تیغ پر　　　　دیکھ کر یہ شوق آنکھیں کھل گئیں جلّاد کی

ہے کہاں بوند اب لہو کی میرے جسمِ زار میں　　　　خون میں کیوں کر نہائے گی چھری جلّاد کی

اضطرابِ دل نے مجھ پر اور بھی ڈھایا ستم　　　　پھنس گئی تارِ رگِ جاں میں چھری جلّاد کی

سینکڑوں جاں باز ہیں مقتل میں لاکھوں سرفروش　　　　آج باہیں شل نہ ہو جائیں کہیں جلّاد کی

سانس کی ہے آمد و شد عشق میں اب ناگوار　　　　بن گئی یہ بھی چھری چلتی ہوئی جلّاد کی

بے ہنسے بولے ہوئے کرتی ہے یہ سب کو ہلاک　　　　کس قدر جلّاد ہے تصویر بھی جلّاد کی

حشر میں نکلا نہ مُنہ سے شکوۂ ظلم و ستم
رہ گئے بسملؔ بھی صورت دیکھ کر جلّاد کی

مشاعرہ الہ آباد ۱۹ر فروری ۱۹۲۲ء

موسمِ گُل میں یہی رائے ہے دیوانوں کی
دھجیاں اب ہوں لگاتار گریبانوں کی

مٹ گئی شمع کی تنویر وہ سب رات کے ساتھ
خاک بھی اب نظر آتی نہیں پروانوں کی

وہی وحشت وہی سودا وہی اندازِ جنوں
شکل بدلی نہیں اب تک ترے دیوانوں کی

پھول کے بدلے چڑھا جاتے ہیں اہلِ وحشت
دھجّیاں تُربتِ مجنوں پہ گریبانوں کی

بیڑیاں ڈال کے زنداں میں نہ رکھیں احباب
خاک اُڑانی ہے ابھی مُجھ کو بیابانوں کی

گُلِ صد برگ کو وہ دیکھ کے فرماتے ہیں
خاص پہچان ہے یہ چاک گریبانوں کی

ئیں صنم خانے کو مسجد سے چلا جب بسمل
اُنگلیاں اُٹھنے لگیں مُجھ پہ مسلمانوں کی

۹ر جنوری ۱۹۲۷ء

حسبِ فرمائش بابو شمبھو ناتھ صاحب، وکیل جے پور (راجپوتانہ)

پیشتر سے تھا مجھے روشن حسابِ زندگی
ڈوب جائے گا کبھی دن آفتابِ زندگی

یہ نصیحت کر رہا ہے ساقیِ روزِ ازل
ہو نہ جانا مست پی پی کر شرابِ زندگی

زندہ رہنے والے کچھ اس کو بتا سکتے نہیں
مرنے والوں سے کوئی پوچھے حسابِ زندگی

کیوں نہ ہو درسِ جہاں میں اُس کو پورا تجربہ
عُمر بھر اُلٹے جو اوراقِ کتابِ زندگی

سینکڑوں غم ہیں ہزاروں رنج ہیں لاکھوں الم
کیا بتاؤں آپ سے کیا ہے حسابِ زندگی

دل اگر خوش ہے تو سب کچھ خوش نہیں تو کچھ نہیں
یہ ثوابِ زندگی ہے یہ عذابِ زندگی

رہ نہیں سکتا کبھی اِس کا سرور اِس کا خُمار
پینے والے کیا کریں پی کر شرابِ زندگی

بام پر آنے کو اے بسمل ہے کوئی مہروش
آج ہے شاید لبِ بام آفتابِ زندگی

---

۱۹ دسمبر ۱۹۲۲ء

مشاعرہ اسلامیہ اسکول الہ آباد

سمجھ لوں ہو گئی حد اب جنونِ فتنہ ساماں کی
ملے دامن کے ٹکڑے سے اگر دھجّی گریباں کی

ترے وحشی نے چھٹ کر راہ لی جس دم بیاباں کی
وہ ہنگامہ اُٹھا ہلنے لگی دیوارِ زنداں کی

بسایا جب سے تُو نے خانۂ صیّاد اے بُلبُل
چمن کا رنگ بدلا ہو گئی دُنیا گلستاں کی

صِلہ اچھّا یہ پایا میں نے اپنی جان دینے کا
لئے ہے گود میں مجھ کو زمیں گورِ غریباں کی

کُھلیں آنکھیں ہماری دشت پیمائے جنوں ہو کر
نظر آتی ہے ذرّے ذرّے میں وسعت بیاباں کی

جہاں میں جن کو سب اہلِ جہاں مٹّی سمجھتے ہیں
انھیں ذرّوں کے ملنے سے بنی تصویر انساں کی

سمجھ کا پھیر تھا اس کو قضا کہنے لگی دُنیا
گرہ جب کُھل گئی ترکیبِ اجزائے پریشاں کی

چُبھے کانٹے جو صحرا میں تو تلوؤں سے لہو نکلا
اِسی سے رشکِ گلشن ہو گئی مٹّی بیاباں کی

نرالے اک تمھیں ہندو نظر آئے زمانے میں
بُتوں کے سامنے بسملؔ قسم کھاتے ہو قرآں کی

مشاعرہ گوالیار ۲۸ اگست ۱۹۲۴ء

مآلِ عشق اچھا ہو یہی ہے التجا میری
تمھارے ہاتھ سے آئے اگر آئے قضا میری

مجھے ناکام رکھتی ہے تجھے بدنام کرتی ہے
جفا کس کی جفا تیری وفا کس کی وفا میری

ذرا اے بے خودیِ شوق یہ مجھ کو بتا دینا
ہوئی کب ابتدا میری ہوئی کب انتہا میری

مصیبت میں کسی کا ساتھ کوئی دے نہیں سکتا
ہوا خواہی قفس میں کرچکی بادِ صبا میری

مجھے کچھ اُن سے کہنا تھا مگر ایسے میں کیا کہتا
وہ جب آئے تو اُن کے ساتھ آپہنچی قضا میری

اگر مجھ پر نہ تم دُنیائے اُلفت میں جفا کرتے
تو پھر مشہورِ عالم کس طرح ہوتی وفا میری

تہ و بالا کیا صحرا کو ایسا جوشِ وحشت نے
کہ میرے سر پر اب آنے لگی خود خاکِ پا میری

جو مرجانے کو کہتے ہو تو اُٹھو جاؤ بالیں سے
تمھارے سامنے ہرگز نہ آئے گی قضا میری

وہ ظالم کس قدر رویا وہ قاتل کس قدر تڑپا
اُسے جب یاد آئی حضرتِ بسملؔ وفا میری

مشاعرہ ہندو کالج بنارس ۲۴ر نومبر ۱۹۲۳ء

بگڑی ہوئی جہاں میں اُسی کی سنور گئی ۔ جس کی نظامِ دہر پہ گہری نظر گئی

بیماریِ فراق نصیحت یہ کر گئی ۔ بگڑی وہی تو بات جو حد سے گُذر گئی

مرنے کے وقت خیر جو گُذری گُذر گئی ۔ تم آگئے تو اب مری مٹّی سنور گئی

احباب چارہ گر کو دُعا دے رہے ہیں کیوں ۔ شاید مریضِ غم کی طبیعت ٹھہر گئی

جلوہ دکھا کے طُور پہ روپوش ہو گیا ۔ اچھے پڑا اے حکیم تمھاری نظر گئی

عالم نظامِ عشق کا بدلا بُری طرح ۔ جس سمت میری مُوت کی اُڑ کر خبر گئی

مَیں کیا بتاؤں جا کے رُکی کس مقام پر ۔ میری نظر جو حدِّ نظر سے گُذر گئی

قاتل تری نگاہ میں تیزی غضب کی ہے
بسمل پھر آج حضرتِ بسملؔ کو کر گئی

۱۲ر اگست ۱۹۲۹ء

حسب فرمائش منشی کیلاش بہاری لال صاحب ایم ۔ اے ایل ایل ۔ بی ، ایڈوکیٹ ، الہ آباد

کس بے رُخی سے آپ نے مجھ پر نگاہ کی ۔ دُنیا خراب کی مری مٹّی تباہ کی

رحمت نے مجھ پہ حشر میں ایسی نگاہ کی ۔ سر سے اُتر کے گر پڑی گٹھری گُناہ کی

دیتا ہے بار بار دُہائی نگاہ کی ۔ تم نے یہ کس غریب کی مٹّی تباہ کی

کہتی ہے جس کو خلق تجلّیِ برقِ طُور ۔ ہلکی سی وہ جھلک تھی تری جلوہ گاہ کی

دل سے تصوّرِ شبِ غم پر نثار ہوں ۔ تصویر دیکھ لی تری زُلفِ سیاہ کی

مدّت ہوئی کہ اُن سے نگاہیں نہیں لڑیں ۔ لیکن نگاہ میں ہے وہ شوخی نگاہ کی

تلوار چھُٹ کے گر پڑی قاتل کے ہاتھ سے
مقتل میں ایسی بسملِؔ مُضطر نے آہ کی

مشاعرہ الہ آباد ۳۰ جنوری ۱۹۲۶ء

بنا یہی تھی زمانے میں دل لگانے کی
کہانیاں بنیں لاکھوں مرے فسانے کی

یہ راہ دیکھتی ہے کب سے اُن کے آنے کی
مری نظر کو خبر کچھ نہیں بہانے کی

کوئی ہوس نہ کرے اُن سے دل لگانے کی
لکھی گئی یہی سُرخی مرے فسانے کی

کہیں جو شیشہ و ساغر کو ہم نے دیکھ لئے
نظر میں پھر گئی صورت شراب خانے کی

بچے گا آپ نہ فصلِ بہار میں دامن
کسی کو فکر ہو کیا دھجّیاں اُڑانے کی

سنبھل کر آپ سُنیں مجھ سے داستانِ فراق
بیانِ حشر ہے تمہید اِس فسانے کی

اسیرِ زلف ہلاتا ہے پانو کی زنجیر
کہیں نہ گر پڑے دیوارِ قید خانے کی

کچھ اور بن نہ پڑی اُن سے ہو گئے وہ خموش
جب آئی حشر میں باری مرے فسانے کی

یہ کس کے مُنہ میں زباں ہے جو کہہ سکے بسملؔ
مری زبان نہیں داغؔ کے گھرانے کی

مشاعرہ الہ آباد ۳۰ جنوری ۱۹۲۹ء

بہ قیدِ یک قافیہ

وہ اب نکالو جو صورت ہو مُنہ دکھانے کی
ازل کے دن سے نظر تم پہ ہے زمانے کی

ہجومِ رنج والم دیکھ کر وہ پوچھتے ہیں
تمھارے دل کی یہ دُنیا ہے کس زمانے کی

تری گلی میں ہمارا قدم نہیں جمتا
ہَوا ہے اُکھڑی ہوئی آج کل زمانے کی

خوشی کی مجھ کو خوشی کیا ہو غم کا غم کیا ہو
نظر میں دو رُخی تصویر ہے زمانے کی

ابھی وہ اہلِ مُحبّت کا حال کیا جانیں
ابھی ہَوا نہیں اُن کو لگی زمانے کی

خدائی بھر کے حسیں پھر رہے ہیں آنکھوں میں
نظر پہ ختم ہوئی ہیں حدیں زمانے کی

بلا تھا اُن کا لڑکپن ستم ہے اُن کا شباب
غضب کی صورتیں دونوں ہیں دو زمانے کی

نشاط و عیش پہ مَیں مطمئن نہیں ہوتا
مری نظر میں ہیں نیرنگیاں زمانے کی

دمِ اخیر نہیں کوئی پوچھنے والا
مری طرف سے نظر پھر گئی زمانے کی

اُنھیں ہے جلوہ فروزی کی آرزو بسملؔ
نظر ہے کس لئے محدود پھر زمانے کی

---

۱۹ ستمبر ۱۹۳۰ء

حسب فرمائش بابو رگھو راج پرشاد صاحب رئیس بلرام پور

راہِ اُلفت میں نکل آئے گا حاصل کوئی
ختم منزل نہ ہو ایسی نہیں منزل کوئی

رنگ اُلفت کا جما نا نہیں مشکل کوئی
دیکھ لے کاش مرا خونِ رگِ دل کوئی

مَوجِ دریائے مُحبّت کا یہی مطلب ہے
لُطف کے ساتھ نہ ٹھہرے لبِ ساحل کوئی

سب اِسی فکر میں دن رات رہا کرتے ہیں
مرنے جینے کا بتا دے ہمیں حاصل کوئی

دُور خود ہو گئی تاریکیِ غربت مجھ سے
کیوں جلاتا ہے چراغ اب سرِ منزل کوئی

اور جینے کی تمنّا نہیں مرنے دیتی
ہم سمجھتے تھے کہ مرنا نہیں مشکل کوئی

دل کو اب آنے لگا قتل گہِ ناز میں لُطف
اور بسمل کرے اے حضرتِ بسملؔ کوئی

۲۴ر اکتوبر ۱۹۲۵ء

مشاعرہ کایستھ پاٹھ شالہ الہ آباد

قدر کرنی چاہیئے تم کو دلِ نخچیر کی
اُس کے دم سے اتنی شہرت ہے تمھارے تیر کی

رُوح آنکھوں میں کھنچ آئی عاشقِ دل گیر کی
کس قدر دل کش ادائیں تھیں تری تصویر کی

تیر والے تو نے دیکھی چال اپنے تیر کی
اِس نے دُنیا ہی بدل ڈالی دلِ نخچیر کی

دردِ اُلفت سے شبِ غم اس نے کب پائی نجات
کروٹوں میں عُمر گذری عاشقِ دل گیر کی

گُلشنِ عالم نے مجھ کو محوِ حیرت کر دیا
پتّی پتّی میں جھلک دیکھی تری تصویر کی

اپنے اپنے لختِ دل حاضر کریں گے اہلِ دل
آج سُنتا ہوں کہ دعوت ہے تمھارے تیر کی

میں قفس میں ہوں مگر ہے برق کو اب بھی تلاش
آگ بھڑکانے لگی گردش مری تقدیر کی

نزع میں نکلے مرا ارمان خاموشی کے ساتھ
مرتے دم لے لوں بلائیں میں تری تصویر کی

دوست دُشمن ہو گئے اپنے پرائے ہو گئے
یہ بھی اک گردش تھی اے بسملؔ مری تقدیر کی

۲۰ نومبر ۱۹۲۸ء

مشاعرہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس لاہور

سب کہہ رہے ہیں شرحِ تمنّا کرے کوئی　　قابو میں دل اگر نہ ہو تو کیا کرے کوئی
اپنے کو مُفت کس لئے رُسوا کرے کوئی　　وہ ہل چکے ہزار تمنّا کرے کوئی
میں ایک ہی نگاہ میں پہچان جاؤں گا　　جلوے ہزار طرز کے پیدا کرے کوئی
محشر میں سب کے آگے ہو افشائے رازِ عشق　　وہ خود ہی چاہتے ہیں کہ شکوا کرے کوئی
ہم دیکھنے کے واسطے ترسا کریں چہ خوش　　پردے میں بیٹھ کر ہمیں دیکھا کرے کوئی
دل لے چلا ہے مجھ کو تماشے کے واسطے　　ایسا نہ ہو کہ دل کو تماشا کرے کوئی
مرنے کے بعد بھی رہی مرنے کی آرزو　　مُجھ سا شہیدِ ناز تو پیدا کرے کوئی
بزمِ سخن میں حضرتِ بسمل کے سامنے　　دُشوار ہے زبان کا دعویٰ کرے کوئی

---

۱۰ اکتوبر ۱۹۲۵ء

(طبع زاد)

بہ قیدِ یک قافیہ

جو نہ کرنا تھا کر گیا کوئی　　وقت سے پہلے مر گیا کوئی
عشق میں نام کر گیا کوئی　　آ گئی موت مر گیا کوئی
تم نہ آئے تو یہ ستم ٹوٹا　　خود کُشی کر کے مر گیا کوئی
ضبطِ اُلفت کا یہ مآل ہُوا　　آپ ہی آپ مر گیا کوئی
اب تو کوئی تمھیں ملال نہیں　　اب تو خوش ہو کہ مر گیا کوئی
وہ نہ آئے تو بسترِ غم پر　　کر کے اک آہ مر گیا کوئی
پوچھتے ہیں وہ کس تغافل سے　　ہم یہ سُنتے ہیں مر گیا کوئی
تمھیں سوچو تمھیں خیال کرو　　کیوں یہ بے موت مر گیا کوئی
جی اُٹھا کوئی دیکھ کر تم کو　　دیکھ کر تم کو مر گیا کوئی
اس پہ بگڑے ہیں وہ کہ بے پوچھے　　کس لئے آج مر گیا کوئی

دیکھنے بھی نہ آئے وہ بسمل
اس تمنّا میں مر گیا کوئی

۱۵ مارچ ۱۹۲۷ء

طبع زاد

گلزار میں آیا موسمِ گُل اللہ رے جوانی پھولوں کی
اب پھول کے بُلبل کہتی ہے پھولوں سے کہانی پھولوں کی

صیّاد کے گھر میں کہتا ہے یوں کوئی کہانی پھولوں کی
جانچی پرکھی دیکھی بھالی میں نے بھی جوانی پھولوں کی

رہ جائے گی کہنے سُننے کو گُلشن میں کہانی پھولوں کی
کے روز یہ عالم پھولوں کا دُنیا ہے یہ فانی پھولوں کی

جب موسمِ گُل کا ذکر آیا تو اشک بہائے گُل چیں نے
تصویر کی صورت پھرنے لگی آنکھوں میں جوانی پھولوں کی

اے بادِ خزاں یہ ظلم وستم پتّے بھی الگ شاخیں بھی جُدا
گُلشن میں نہ رہنے پائے گی کیا کوئی نشانی پھولوں کی

گُل چیں بھی مخالف صرصر بھی کچھ بس نہیں چلتا بُلبل کا
مٹّی میں ملائی جاتی ہے پُرجوش جوانی پھولوں کی

وہ محفلِ گُل باقی نہ رہی وہ اہلِ چمن باقی نہ رہے
اب کون سُنائے گا ہم کو دلچسپ کہانی پھولوں کی

گُل چیں کا بھروسہ خاک کروں اُمید خزاں سے کیا رکھوں
وہ دُشمنِ روحی پھولوں کا یہ دُشمنِ جانی پھولوں کی

گُلشن میں نہ کیوں کر دل بہلے وہ سُنتے ہیں مَیں سُنتا ہوں
پھولوں سے فسانہ بُلبل کا بُلبل سے کہانی پھولوں کی

بلبل کے مقدر سے بےشک تقدیر اسی کی اچھی ہے
چل پھر کے صبا ہی چومتی ہے کیا کیا پیشانی پھولوں کی

مضمون کے گُل کیوں کر نہ کھلیں بسمل پھر صفحۂ کاغذ پر
سَو رنگ سے لکھی ہے تم نے خوش رنگ کہانی پھولوں کی

مشاعرہ کایستھ پاٹھ شالہ بورڈنگ فیض آباد ۳۰ ردسمبر ۱۹۲۸ء

طریقِ عشق میں بس ایک یہ ہے آرزو میری
کہ میں ہو جاؤں گم کرتے پھریں وہ جستجو میری

تلاشِ یار میں نکلی نہ پھر بھی آرزو میری
کہاں سے لے گئی مجھ کو کہاں تک جستجو میری

ٹھہر اے بےخودیِ شوق مجھ کو بات کرنے دے
ابھی خلوت میں دل سے ہو رہی ہے گفتگو میری

دمِ ظلم و ستم میں دل ہی دل میں شاد ہوتا ہوں
نکلتی ہے دہن سے آہ بن کر آرزو میری

زبانِ عشق سے میں واقعاتِ حسن کہتا ہوں
سمجھ میں دوستوں کی آئے کیوں کر گفتگو میری

دمِ جوشِ جنوں ہر سمت کیا کیا خاک اڑاتا ہوں
ملا دے گی کبھی مٹی میں مجھ کو آرزو میری

یہ اچھی جستجو ہے جستجو کیا ہے تماشا ہے
مجھے ہے جستجو اُن کی انھیں ہے جستجو میری

کسی کے واسطے میں خون کے آنسو جو روؤں گا
تو ہو کر سرخ رو نکلے گی دل سے آرزو میری

وہ سن کر ہاتھ اپنے کان پر رکھیں گے اے بسملؔ
اثر میں اس قدر ڈوبی ہوئی ہے گفتگو میری

آل انڈیا مشاعرہ میرٹھ ۳۰ اگست ۱۹۱۹ء

برقید یک قافیہ

آج برسوں میں ملا موقعہ یہ مشکل سے مجھے
دل کے بس دو حرف کہنے ہیں ترے دل سے مجھے

کیا گلہ قاتل سے کیا شمشیرِ قاتل سے مجھے
رنج جو پہنچا وہ پہنچا عشق میں دل سے مجھے

میں نے جس پر جان دی تھی یہ بھی اُس پر مر مٹا
ایک روحانی تعلّق ہو گیا دل سے مجھے

دو طرح کا عشق ہے لیکن وہی ہے ایک عشق
میرے دل سے ہو تجھے یا ہو ترے دل سے مجھے

اُن کا جلوہ کہہ رہا ہے میں تو ہوں چاروں طرف
دیکھنے والا جو دیکھے دیدۂ دل سے مجھے

وہ یہ کہتے ہیں اگر پہلو میں تیرے دل نہیں
دل میں کیا رکھّے گا کیا چاہے گا تُو دل سے مجھے

جان جب میں نے کہا اُس کو تو وہ کہنے لگا
ہو گئی اب خاص نسبت آپ کے دل سے مجھے

خاک ہوں گا خاک ہو کر خاک میں مل جاؤں گا
کیوں گراتے ہیں نظر سے آپ کیوں دل سے مجھے

کر دیا بسملؔ کو اُس قاتل نے بسمل اور بھی
اس قدر کہہ کر نہیں تم چاہتے دل سے مجھے

آل انڈیا مشاعرہ میرٹھ ۳۰ر اگست ۱۹۱۹ء

فائدہ تو اِس قدر ہو جذبِ کامل سے مجھے
مر کے بھی اُٹھنے نہ دے یہ کوئے قاتل سے مجھے

میں محبت میں غنیمت جانتا ہوں اِس کو بھی
کچھ نہیں مشکل جو وہ مل جائیں مشکل سے مجھے

قصد ہوتا ہے کہ بزمِ دہر سے اُٹھ جاؤں اب
خود اُٹھانے آئے ہیں وہ اپنی محفل سے مجھے

بحرِ غم میں ناخدا بھی ہاتھ مل کر رہ گیا
کشتیِ دل لے چلی جب دور ساحل سے مجھے

گردن و سر میں بہت کچھ اس نے ڈالا تفرقہ
پھر بھی الفت ہے وہی شمشیرِ قاتل سے مجھے

غیر اُٹھائے اُس ہیں یہ ہمت نہیں طاقت نہیں
آپ جب چاہیں اُٹھا دیں اپنی محفل سے مجھے

چاہتا ہوں یہ کہ میں ہو جاؤں غرقِ بحرِ عشق
جال موجوں کے لگا دیتے ہیں ساحل سے مجھے

موت آئی تھی یہاں تو دفن کرنا تھا یہیں
لوگ کیوں لے جا رہے ہیں کوئے قاتل سے مجھے

کس نظر سے دیکھتا میں آنا جانا غیر کا
خود بہ خود اُٹھنا پڑا آج اُن کی محفل سے مجھے

کیا بلا بسملؔ کو بسمل کر کے تجھ کو کیا ملا
پوچھنا ہے آج مقتل میں یہ قاتل سے مجھے

مشاعرہ ہندو بورڈنگ ہاؤس الہ آباد ۳۰ نومبر ۱۹۱۹ء

شاید ملا یہ فیضِ دلِ داغدار سے
لَو کیسی اُٹھ رہی ہے چراغِ مزار سے

اُن کو بھی اُن کے جلوہ فروشی کی آرزو
پردے میں بیٹھنے ہی نہ دے گی قرار سے

اللہ رے غبار کہ مرنے کے بعد بھی
رہتے ہیں دُور دُور وہ میرے مزار سے

بیٹھے ہوئے قفس میں اسیرانِ بدنصیب
کچھ عرض کر رہے ہیں نسیمِ بہار سے

مٹی میں مل کے یہ ہمیں حاصل ہوا شرف
دبتا ہے آسماں بھی ہمارے غبار سے

جو کر چکا ہے سیر سپید و سیاہ کی
ڈرتا نہیں وہ گردشِ لیل و نہار سے

کاجل بنا وہ دیدۂ اہلِ نگاہ کا
اُٹھا دُھواں جو میرے چراغِ مزار سے

وارفتگانِ عشق کی تقدیر دیکھنا
تکیہ لگائے بیٹھے ہیں دیوارِ یار سے

دستِ جنوں کا مشغلہ موقوف ہو گیا
چھٹتی نہیں اب اُنگلیاں دامن کے تار سے

صبحِ نشاط ہے کہیں شامِ ملال ہے
آنکھیں کھُلیں دو رنگیِ لیل و نہار سے

اے بسمل اُن کو چین ملے یہ محال ہے
بسمل ہوئے جو خنجرِ ابروئے یار سے

۱۵ دسمبر ۱۹۲۰ء

(طبع زاد)

بہ قید یک قافیہ

آہ سے دل کا داغ جلتا ہے　　یہ ہوا میں چراغ جلتا ہے
خود بخود دل کا داغ جلتا ہے　　بے جلائے چراغ جلتا ہے
خانۂ دل میں داغ جلتا ہے　　بند گھر میں چراغ جلتا ہے
کیوں نہ روشن ہو محفلِ عالم　　سب کے گھر میں چراغ جلتا ہے
داغِ دل کام آیا مرنے پر　　قبر میں یہ چراغ جلتا ہے
غیر کے گھر وہ جانے والے ہیں　　رہ گذر میں چراغ جلتا ہے
اُس کی قدرت کا واہ کیا کہنا　　آسماں پر چراغ جلتا ہے
اپنی محفل سے پھینک دو باہر　　رشک سے ہر چراغ جلتا ہے
ہے شرر اس میں حسنِ قدرت کا　　سنگ میں بھی چراغ جلتا ہے
بے کسی ہے غضب کی مدفن پر　　جھلملا کر چراغ جلتا ہے
نُور پھیلا ہے اُس کا کعبے میں　　بُت کدے میں چراغ جلتا ہے
شام سے صبح تک شبِ فرقت　　ساتھ میرے چراغ جلتا ہے
کون دل سوز ہے فنا کے بعد　　قبر پر کب چراغ جلتا ہے
دل میں ہے یادِ روئے جاناں کی　　آئینہ میں چراغ جلتا ہے
نورِ حق میں اُسے سمجھتا ہوں　　طُور پر جو چراغ جلتا ہے
مر رہے ہیں پتنگے جل جل کر　　اِسی غم میں چراغ جلتا ہے
آہِ مظلوم گُل کرے گی اُسے　　ظُلم کا کب چراغ جلتا ہے
روبرو اس کے تم جو آتے ہو　　جل کے کیسا چراغ جلتا ہے
اُس کی قدرت سے حضرتِ موسیٰ　　ہاتھ میں بھی چراغ جلتا ہے
چشمِ تر میں نہیں ہے لختِ جگر　　لبِ ساحل چراغ جلتا ہے
قیس کی آہِ شعلہ بار نہ ہو　　دشت میں جو چراغ جلتا ہے
طبع روشن سے اپنی اے بسملؔ　　ہر زمیں پر چراغ جلتا ہے

مشاعرہ بھگوت باغ الہ آباد ۱۴ر اپریل ۱۹۲۲ء

یہ مشاعرہ بسملؔ صاحب کے اہتمام سے ہوا تھا۔

کوئی رہنے کو کسی کے خانۂ دل میں رہے
سب سے اچھا ہے وہی جو تیری محفل میں رہے

کشمکش میں پھنس گئے زحمت میں مشکل میں رہے
آپ بے سمجھے ہوئے کیوں غیر کے دل میں رہے

کوئی تو اپنا شریکِ حال مشکل میں رہے
تم نہیں رہتے تمھاری یاد ہی دل میں رہے

یہ ہے کوئی بات بھی یہ ہے کوئی انصاف بھی
ہم نہ رہنے پائیں دُنیا تیری محفل میں رہے

اُس طرف محشر کا کھٹکا اِس طرف دُنیا کا شوق
مرنے والا مرتے دم کیوں کر نہ مشکل میں رہے

سچ کہی یہ بات تو نے اے گرفتارِ قفس
دل نہ ہو تو کیا خیالِ آشیاں دل میں رہے

بہتے بہتے لاش آخر کو کنارے آ لگی
غرقِ دریا ہو کے ہم آغوشِ ساحل میں رہے

ہیں وہی تنکوں میں تنکے جو بنائیں آشیاں
گُل وہی گُل ہے جو منقارِ عنادل میں رہے

برق و صرصر کو ہمارے آشیاں سے لاگ تھی
چار تنکوں کے بدولت ہم بھی مشکل میں رہے

ہو بُتوں کی آرزو عشقِ خدا کے ساتھ ساتھ
ایک بُت خانہ بھی اپنے کعبۂ دل میں رہے

اُس کی قسمت اُس کی تقدیر اُس کا بخت اُس کا نصیب
جو تیرے کوچے میں ٹھہرے تیری محفل میں رہے

غور سے دیکھے کوئی کثرت میں یہ وحدت کی شان
ایک تُو ہے اور دُنیا بھر کے تو دل میں رہے

مل گئی صدموں سے فرصت جان دے دینے کے بعد
دم میں جب تک دم رہا ہم سخت مشکل میں رہے

یہ دُعائیں مانگتا تھا آج ایک ایذا طلب
درد بھی دل میں رہے بے درد بھی دل میں رہے

کُشتۂ تیغِ محبت کیا ہلائے ہاتھ پانوٗ
دم رہے تو دم تڑپنے کا بھی بسملؔ میں رہے

مشاعرہ سنٹرل ہندو کالج بنارس ۱۵ر نومبر ۱۹۲۶ء

یوں تو پہلو میں تمہارا تیر میرا دل بھی ہے
دونوں کا مل جل کے رہنا سہل بھی مشکل بھی ہے

حال منزل کا اگر پوچھیں تو پوچھیں کس سے ہم
دُور سب منزل سے ہیں کوئی سرِ منزل بھی ہے

تم کو میرے عشق پر کچھ غور کرنا چاہیئے
بے طلب دیتا ہوں دل ایسا کسی کا دل بھی ہے

نزع کے عالم میں وہ آئے عیادت کے لئے
اِس سے ثابت ہو گیا مرنا مرا مشکل بھی ہے

ہم کسی کے ہجر میں تنہا مرے تنہا جیئے
ایسے جینے اور مرنے کا کوئی حاصل بھی ہے

کہنے سُننے کے لئے یوں تو ہیں دل والے بہت
ڈال دے جو دل میں دل ایسا کسی کا دل بھی ہے

چلتے چلتے تھک گیا چکر میں ہوں مثلِ غُبار
رہ برِ منزل بتا میری کوئی منزل بھی ہے

قتل گاہِ ناز میں وہ پوچھتے ہیں بار بار
اور سب موجود ہیں لیکن کہیں بسمل بھی ہے

مشاعرہ ریلوے انسٹیٹیوٹ الہ آباد ۱۹ر نومبر ۱۹۲۶ء

(بہ قیدِ یک قافیہ)

سرگذشتِ غم کہی یوں عاشقِ دل گیر نے
ہاتھ پھیلائے لپٹنے کو تری تصویر نے

دل بچایا ہر طرح گو عاشقِ دل گیر نے
اُس کو اپنا کر لیا لیکن تری تصویر نے

جب کیا اظہارِ غم کچھ عاشقِ دل گیر نے
کن بُری نظروں سے دیکھا آپ کی تصویر نے

ہو گئی چُپ چاپ دُنیا دل کی دُنیا دیکھ کر
کر دیا تصویر عالم کو تری تصویر نے

گھر کی زینت کے لئے سب مول لیتے تھے شبیہہ
مول سب کو لے لیا لیکن تری تصویر نے

نقش حیرت بن گیا میں عیش و غم کو دیکھ کر
میری آنکھیں کھول دیں اِس دو رُخی تصویر نے

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے میں تو سمجھا لفظ لفظ
چُپکے چپکے کہہ دیا سب کچھ تری تصویر نے

جسمِ انساں سے کھُلا رازِ مآلِ زندگی
خوب یہ خاکہ اُڑایا خاک کی تصویر نے

حضرتِ بسمل کے دل کا آج نقشہ اور ہے
نیم بسمل کر دیا قاتل تری تصویر نے

مشاعرہ ریلوے انسٹی ٹوٹ الہ آباد ۱۹ر نومبر ۱۹۲۶ء
(بہ قید یک قافیہ)

جب ہوا باندھی اِدھر شوقِ دلِ نخچیر نے
اُس طرف لیں کروٹیں ترکش میں اُن کے تیر نے

کوئی دیکھے یہ محبت میں محبت کی کشش
لیں مرے دل کی بلائیں بڑھ کر اُن کے تیر نے

کیوں نہ دل والے منائیں اپنے اپنے دل کی خیر
پر نکالے پھر نئے سر سے تمھارے تیر نے

دم میں جب تک دم رہے گا یہ کرے گا سامنا
کیا تماشا دل کو سمجھا ہے تمھارے تیر نے

آہ بے تاثیر کہتی ہے کہ مجھ میں ہے اثر
کس قیامت کی ہوا باندھی ہوائی تیر نے

دل میں آیا دل میں آ کر پار دل سے ہو گیا
تیر والے چال کیا سیکھی ہے تیرے تیر نے

چوٹ کھا کر قائلِ لطفِ جراحت ہو گیا
دل کو دل جمعی بہت دی دل سے اُن کے تیر نے

دیکھنا مشکل ہوا پہچاننا مشکل ہوا
اِس طرح زخمی کیا دل کو تمھارے تیر نے

خونِ بسملؔ سے کچھ ایسی سُرخ رُوئی مل گئی
رنگ دُنیا میں جمایا اور تیرے تیر نے

مشاعرہ معیار الادب لکھنؤ ۱۴ر جنوری ۱۹۲۷ء

سوزِ اُلفت نے جلا کر خاک کر ڈالا مجھے
مَیں نہیں ملنے کا اب ڈھونڈھا کرے دُنیا مجھے

کس قدر مَیں دل ہی دل میں شاد ہوں دیکھا مجھے
اک ترے ملنے سے گویا مل گئی دُنیا مجھے

خاک ہو کر خاک میں ملنے کا غم کیسا مجھے
مَیں تو یہ سمجھا کہ کچھ سمجھی نہیں دُنیا مجھے

مَیں قفس میں آشیاں کو بھولنے والا نہیں
یاد ہے صیّاد اب تک ایک اک تنکا مجھے

آ گئے کب کھینچ کے جب کھنچنے لگی رگ رگ سے رُوح
وقتِ آخر آپ نے دیکھا تو کیا دیکھا مجھے

کیا ہے اور اِس کے سوا پردے میں رہنے کا سبب
چاہتے ہیں وہ یونہی ڈھونڈھا کرے دُنیا مجھے

کس قدر بے فیض نکلی باغِ عالم کی بہار
ایک اک پھُول اِس چمن کا ہو گیا کانٹا مجھے

وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھ پر جان دیتے ہو عبث
مَیں یہ کہتا ہوں دکھاؤ دوسرا ایسا مجھے

بے رُخی ایک اِک نے برتی رُخ تمہارا دیکھ کر
جو نہ کہنا تھا مُناسب کہہ گئی دُنیا مجھے

جلوۂ دیدار سے موسیٰ کو تو غش آ گیا
اب نہ یہ کہنا کسی نے بھی نہیں دیکھا مجھے

زندگی میں قدر اے بسملؔ مری ہوتی نہیں
بعد مر جانے کے روئے گی بہت دُنیا مجھے

مشاعرہ بھگوت باغ الٰہ آباد ۳۰ رمئی ۱۹۲۵ء

یہ مشاعرہ بسمل صاحب کے اہتمام سے ہوا تھا۔

ہو گئے پیوست یوں پیکاں تمھارے تیر کے　　رُوح باہر آ گئی دل سے مرا دل چیر کے

بڑھتے بڑھتے آہ کی ناکامیاں اب بڑھ گئیں　　مِٹتے مِٹتے مِٹ گئے سب حوصلے تاثیر کے

اُن کی نظروں میں زمانے بھر کی شکلیں ہیچ ہیں　　جن کے دل پر کھنچ گئے نقشے تری تصویر کے

پھر گیا رُخ ہی ہوائے دامنِ تدبیر کا　　اُٹھتے اُٹھتے رہ گئے پردے مری تقدیر کے

ہوتے ہوتے دُور کب دل سے ہوا تیرے غبار　　خاک میں جب مل گئے خاکے مری تصویر کے

برق نے پھونکا جو خرمن کو تو حاصل کیا ہوا　　چند دانے رہ گئے پھر بھی مری تقدیر کے

ہوش اُڑ جاتے ہیں سب کے دیکھ کر نقش و نگار　　کھینچنے والے نہیں ملتے تری تصویر کے

ملتے ملتے دفعتاً اُن کی نگاہیں پھر گئیں　　آج قائل ہو گئے ہم گردشِ تقدیر کے

ایک یہ ہے اور لاکھوں طالبِ دیدار ہیں　　دیکھیں کس کس کو ملیں درشن تری تصویر کے

آج تک اہلِ جنوں میں یہ چلی آتی ہے رسم　　تُربتِ مجنوں پہ وہ رکھتے ہیں دامن چیر کے

جس سے باہم دل ملیں آنکھیں ملیں نظریں ملیں　　وہ بتا تدبیر اے مالک مری تقدیر کے

کوہ کن کی لاش کو بھی لے گئے آغوش میں　　اس طرح آئے تھپیڑے موجِ جوئے شیر کے

ہو گئے مشہور اے بسمل حرم میں حق پرست
بُت کدے میں پوجنے والے کسی تصویر کے

مشاعرہ مسلم ہوسٹل الہ آباد ۱۸ نومبر ۱۹۲۶ء

جنونِ عشق میں ہے یا نہیں تاثیر دیکھیں گے
ہلا کر ہم بھی اپنے پانوں کی زنجیر دیکھیں گے

گلے میں طوق دونو پانوں میں زنجیر دیکھیں گے
وہ میرے عالمِ وحشت کی جب تصویر دیکھیں گے

ترے در سے ترے کوچے سے اُٹھنا غیر ممکن ہے
دکھائے گی ہمیں جو گردشِ تقدیر دیکھیں گے

شبیہ حضرتِ یوسف کی شہرت ہے زمانے میں
ملا کر ہم تری تصویر سے تصویر دیکھیں گے

اُنھیں چُن چُن کے رکھیں گے جگر میں دل میں پہلو میں
جو اچھے سب سے ترکش میں ہیں تمھارے تیر دیکھیں گے

یہی اب دوستوں کا مشغلہ اے چارہ گر ہوگا
تری تدبیر دیکھیں گے مری تقدیر دیکھیں گے

گرے غش کھا کے وہ پردہ ابھی اُٹھنے نہ پایا تھا
اِنھیں آنکھوں سے موسیٰ کیا تری تنویر دیکھیں گے

منگا لی اُس نے اب تصویر اپنی حضرتِ بسملؔ
جو دل گھبرائے گا تو کون سی تصویر دیکھیں گے

آل انڈیا مشاعرہ جام جہاں نما لکھنؤ ۲۹ ستمبر ۱۹۲۸ء

چمن والے اُجڑواتے ہیں ہو کر بدگماں ہم سے
بنے گا کس طرح اب اس طرح کا آشیاں ہم سے

نکالی دُشمنی تو نے کہاں کی آسماں ہم سے
بہار آنے نہ پائی اور چھوٹا آشیاں ہم سے

خدا کے واسطے اس کو نہ پوچھ اے باغباں ہم سے
چمن میں آشیاں سے ہم تھے یا تھا آشیاں ہم سے

زباں بھی جب نہیں کھلتی نہیں چلتی نہیں پھرتی
وہ سُننے کے لئے کب آئے دل کی داستاں ہم سے

جفا والے ہمیں کیوں گن رہے ہیں بے وفاؤں میں
گیا ہے کون سا وقتِ محبت رائگاں ہم سے

ازل سے فکر اُن کی جستجو اُن کی تلاش اُن کی
ابد تک رہ نہیں سکتے وہ پردے میں نہاں ہم سے

رہے گی فصلِ گُل جب تک یہ باتیں غیر ممکن ہیں
جُدا ہم آشیاں سے ہوں جُدا ہو آشیاں ہم سے

بتائیں یا چھپائیں کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا
زمانہ پوچھتا ہے دردِ دل کی داستاں ہم سے

ہمارا سلسلہ ہے خاندانِ داغ سے بسمل
جسے ہو سیکھنی وہ سیکھ لے اُردو زباں ہم سے

مشاعرہ الہ آباد ۱۹ ؍ جولائی ۱۹۲۴ء

یہ کیسی آگ ابھی اے شمع تیرے دل میں باقی ہے
کوئی پروانہ جل مرنے کو کیا محفل میں باقی ہے

ہزاروں اُٹھ گئے دُنیا سے اپنی جان دے دے کر
مگر اک بھیڑ پھر بھی کوچہ قاتل میں باقی ہے

ہوئے وہ مطمئن کیوں صرف میرے دم نکلنے پر
ابھی تو ایک دُنیائے تمنا دل میں باقی ہے

ہوا تھا غرق بحرِ عشق اِس انداز سے کوئی
کہ نقشہ ڈوبنے کا دیدۂ ساحل میں باقی ہے

قضا سے کوئی یہ کہہ دے کہ مُشتاقِ شہادت ہوں
ابھی اک مرنے والا کوچۂ قاتل میں باقی ہے

کہاں فُرصت ہجومِ رنج و غم سے ہم جو یہ جانچیں
کہ نکلی کیا تمنا کیا تمنا دل میں باقی ہے

ابھی سے اپنا دل تھامے ہوئے کیوں لوگ بیٹھے ہیں
ابھی تو حشر اُٹھنے کو تری محفل میں باقی ہے

وہاں تھے جمع جتنے مرنے والے مر گئے وہ سب
قضا لے دے کے بس اب کوچۂ قاتل میں باقی ہے

ابھی سے تو نے قاتل میان میں تلوار کیوں رکھ لی
ابھی تو جان تھوڑی سی تنِ بسمل میں باقی ہے

۲۷ مئی سنہ ۱۹۲۳ء

آل انڈیا مشاعرہ مین پوری

جو کہے حالاتِ غم وہ عاشقِ دل گیر ہے
جو بُلائے سے نہ بولے وہ تری تصویر ہے

آئینہ بھی دل گرفتہ شمع بھی دل گیر ہے
جو تری محفل میں ہے وہ صورتِ تصویر ہے

اِس سے بڑھ کر قیس ہوگی اور کیا تاثیرِ عشق
گردنِ لیلیٰ میں تیرے پانو کی زنجیر ہے

ڈھونڈھتے ہو کس لئے ترکش میں اپنے بار بار
میرے دل میرے کلیجے میں تمھارا تیر ہے

پانو رکھئے گا ذرا فرشِ زمیں پر دیکھ کر
ذرّے ذرّے میں دلِ مرحوم کی تصویر ہے

یہ نہیں کہتا کہ صحت مجھ کو ہو ہی جائے گی
چارہ گر تدبیر کر آگے مری تقدیر ہے

پھرتے ہیں رکھے ہوئے سر پر جسے اہلِ جنوں
وہ ہمارے پانو کی اُتری ہوئی زنجیر ہے

شوخیوں سے اک جگہ دم بھر کبھی رہتے نہیں
کھینچنے والی کس طرح پھر آپ کی تصویر ہے

چارہ گر میں ایسا محوِ لذتِ آزار ہوں
یہ نہیں معلوم میرے دل میں کس کا تیر ہے

حشر میں یہ پوچھتا ہے چاہنے والا ترا
وہ کہاں ہے جس کی میرے ہاتھ میں تصویر ہے

سانس جب تک ہے وہیں تک ہم ہیں پابندِ حیات
آدمی کے واسطے تارِ نفس زنجیر ہے

اپنی گویائی کا دعویٰ تھا تجھے بسملؔ مگر
تو بھی اُن کو دیکھ کر چُپ صورتِ تصویر ہے

مشاعرہ پٹنہ ۳۰ مارچ ۱۹۲۴ء

(درگاہ شاہ ارزاں صاحب)

نکلنے کو نکلتے ہیں وہ بچ کر میرے مدفن سے
مگر پھر بھی لپٹ جاتی ہے اُڑ کر خاک دامن سے

غش آیا ہم کو جس کے جلوۂ رُخسار روشن سے
وہ بالیں پر ہوائیں دے رہا ہے اپنے دامن سے

ٹپکتا ہے لہو مقتل میں رِس رِس کر سر و تن سے
کسی کی تیغ جب ملتی ہے کھنچ کر میری گردن سے

اسیری پھر نہ اے صیاد میں سمجھوں اسیری کو
بنائے تُو قفس تنکے اگر لے کر نشیمن سے

خرام ناز جاناں دیکھنے کو آج محشر میں
کوئی انگڑائیاں لیتا ہوا اُٹھتا ہے مدفن سے

مٹا کر مجھ سے کہتے ہیں وہ میرے داغِ ہستی کو
ترے مرنے پر اک دھبہ چھٹا دُنیا کے دامن سے

قفس میں جب سے ہوں دُنیا اُسے برباد کرتی ہے
مرے ہوتے نہ پاتا تھا کوئی تنکا نشیمن سے

یہاں کے ایک ایک پتھر سے ہوتا ہے گماں مجھ کو
پڑی ہے نیو بھی کعبے کی تو دستِ برہمن سے

یہ رنگ آمیزی قاتل کہیں کم ہونے والی ہے
بہے گا حشر تک یونہیں لہو بسملؔ کی گردن سے

مشاعرہ فتح پور ۱۰ ؍ اپریل ۱۹۳۴ء

اِس سبب سے اور اے صیاد جی اُلجھن میں ہے
میں ترے گھر میں ہوں لیکن آشیاں گلشن میں ہے

گھر دیا تھا تو مجھے دینا تھا کچھ آرام بھی
کیوں اندھیرا گھُپ الٰہی اِس قدر مدفن میں ہے

بن گیا جھونکا ہوا کا ڈھونڈھنے والا ترا
اِس گھڑی صحرا میں ہے تو اُس گھڑی گلشن میں ہے

باغِ عالم میں کبھی میں نے چُنے تھے چند پھول
آج تک خوشبو اُنھیں کی یہ مرے دامن میں ہے

مانتا ہوں مَیں بھی یہ اہلِ چمن کا فلسفہ
مَوت ہے کُنجِ قفس میں زندگی گلشن میں ہے

برق اگر چمکے تو پھر کیوں کر رہوں میں مطمئن
جو مری تقدیر کا دانہ ہے وہ خرمن میں ہے

مُسکرا دینے سے مُجھ کو مِل گیا دل کا نشاں
یا تری مُٹھی میں ہے یا گوشۂ دامن میں ہے

زندگی سے نا اُمیدی سینکڑوں غم جان پر
آخری شب آپ کا بیمار کس اُلجھن میں ہے

خار چُبھنے کے لئے ہیں پھول کھِلنے کے لئے
ہے جہاں راحت وہاں تکلیف بھی گلشن میں ہے

ہم کہیں ہندو کہ مُسلم حضرتِ بسملؔ تھیں
ہاتھ میں تسبیح ہے زُنّار بھی گردن میں ہے

مشاعرہ الہ آباد ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۳ء

تیغ مجھ کو دکھائی جاتی ہے — سر پر اب موت آئی جاتی ہے

حشر برپا ہے اُن کے کوچے میں — لاش کس کی اُٹھائی جاتی ہے

کہیں وہ خونِ آرزو نہ کریں — آج مہندی لگائی جاتی ہے

بعد مرنے کے مرنے والوں سے — ایک بستی بسائی جاتی ہے

وہ کہانی مری نہیں سُنتے — جو کہانی سُنائی جاتی ہے

کبھی تُربت بنائی جاتی تھی — آج تربت مِٹائی جاتی ہے

سوزِ غم اور ضبطِ اشکِ رواں — آگ دل کی بُجھائی جاتی ہے

کیوں ہے بے تاب اے مریضِ فراق — موت دم بھر میں آئی جاتی ہے

تیغِ قاتل میں حضرتِ بسملؔ
اور ہی شان پائی جاتی ہے

مشاعرہ گونڈہ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۲۳ء

برگشتگیِ بخت سے بے کار ہو گئے — دامن میں گُل جو ہم نے چُنے خار ہو گئے

آیا جو اُس گلی میں وہ پامال کر گیا — ہم خاک ہو کے سایۂ دیوار ہو گئے

قدرت نے روح جب تنِ خاکی میں پھونک دی — آزاد رہنے والے گرفتار ہو گئے

دُنیا میں ہم تھے نقطۂ موہوم کی طرح — گردش میں آ کے صورتِ پرکار ہو گئے

جلوہ دکھا کے حضرتِ موسیٰ کو طور پر — وہ کیوں چھپے وہ کیوں پسِ دیوار ہو گئے

کرتے ہیں آہ آہ تو اس کا ہے یہ سبب
بسملؔ بھی بسملِ نگہِ یار ہو گئے

۴؍ جولائی ۱۹۳۰ء

حسب فرمائش بابو دوارکا پرشاد صاحب عرف منو صاحب رئیس الہ آباد

دل میں رکھ لے عاشقِ دل گیر اپنے ہاتھ سے
اُس کو دے دو تم جو اپنا تیر اپنے ہاتھ سے

قابلِ توقیر دیوانوں میں وہ دیوانہ ہے
جس کو پہناتے ہو تم زنجیر اپنے ہاتھ سے

کھینچ لوں گا جی بہلنے کے لئے اے ہم نشیں
عالمِ وحشت کی اک تصویر اپنے ہاتھ سے

لذتِ آزار اُس سے پوچھ لے بیداد گر
جو چُبھو لیتا ہو دل میں تیر اپنے ہاتھ سے

مر گیا دیوانۂ گیسوترا زنداں میں آج
کاٹ دے اب پانو کی زنجیر اپنے ہاتھ سے

عشق میں پیش آتے ہیں بسمل کچھ ایسے واقعات
آدمی کھوتا ہے خود توقیر اپنے ہاتھ سے

۴؍ اپریل ۱۹۳۱ء

روزانہ اخبار تیج دہلی کے لئے یہ غزل کہی گئی تھی

کچھ نہ ہو غم کچھ نہ ہو پروائے بربادی مجھے
خاک میں مل کر اگر مل جائے آزادی مجھے

میری بربادی کو کافی ہے یہی جوشِ جنوں
ڈھونڈھنے جانا ہے کیا سامانِ بربادی مجھے

پھول تو ہیں پھول میں دو چار تنکے چُن سکوں
باغِ عالم میں نہیں اتنی بھی آزادی مجھے

چشمِ عبرت میں جو بربادی کی ہے زندہ نظیر
یاد ہے شہرِ خموشاں کی وہ آبادی مجھے

سب سے کہتے پھرتے ہیں وہ میری بربادی کا حال
کر رہی ہے اس طرح مشہور بربادی مجھے

میں نے جانا منظرِ گورِ غریباں دیکھ کر
حاصلِ دُنیا ہے یہ تھوڑی سی آبادی مجھے

دل سے اے بسمل فدا ہوں میں عروسِ مرگ پر
بس اسی سے تو پسند آتی نہیں شادی مجھے

آل انڈیا مشاعرہ کانپور ۱۱ر جنوری سنہ ۱۹۳۰ء

جینے والا یہ سمجھتا نہیں سودائی ہے
زندگی موت کو بھی ساتھ لگا لائی ہے

یہ بھی مشتاقِ ادا وہ بھی تمنائی ہے
کھینچ کے دُنیا ترے کوچے میں چلی آئی ہے

کھُل گئے نزع میں اسرارِ طلسمِ ہستی
زیست کہتے ہیں جسے موت کی انگڑائی ہے

کہہ گئے اہلِ چمن یہ ترے دیوانوں سے
ہوش میں آؤ زمانے میں بہار آئی ہے

مَیں کسی روز دکھاؤں دلِ صدچاک ادا
تجھ کو معلوم تو ہو کیا تری انگڑائی ہے

ڈھونڈھتی کیوں نہ رہے اُس کو ابد تک دُنیا
جس نے چھُپنے کی ازل ہی میں قسم کھائی ہے

پھوٹ کر پاؤں کے چھالے مرے لائے یہ رنگ
باغ تو باغ ہے صحرا میں بہار آئی ہے

جلوۂ روزِ ازل نے مجھے بے چین کیا
پہلی دُنیا میں یہ پہلی تری انگڑائی ہے

جس کی صحت کے لئے آپ دُعائیں مانگیں
ایسے بیمار کو بھی موت کہیں آئی ہے

تیغِ قاتل کو پسِ قتل ندامت ہو گی
دم سے بسملؔ ہی کے یہ معرکہ آرائی ہے

مشاعرہ فیض آباد ۲۳-۲۴ر دسمبر ۱۹۲۹ء

اس سبب سے دُہرا دُہرا لطف مے خانے میں ہے
آپ کی انگڑائیوں کا عکس پیمانے میں ہے

بھیڑ رندوں کی بہت کچھ آج مے خانے میں ہے
کتنی شیشے میں ہے ساقی کتنی پیمانے میں ہے

کیا بتاؤں کیا کہوں کیا رنگ مے خانے میں ہے
دونوں عالم کا سماں اک میرے پیمانے میں ہے

جلوۂ دل کش نظر آئے تو اُس کو دیکھ لے
اب بھی اتنا ہوش باقی تیرے دیوانے میں ہے

چار چھ تنکوں نے کیسا نام روشن کر دیا
برق مہماں ان کے دم سے میرے کاشانے میں ہے

شمع جل کر کیوں نہیں لیتی خود اس کا امتحاں
اُس کے دم سے قوتِ پرواز پروانے میں ہے

پینے والا کیوں نہ ہو مستِ شرابِ بے خودی
عکس اُن آنکھوں کی گردش کا بھی پیمانے میں ہے

روئے روشن سے ہٹاتے ہیں وہ زلفیں بار بار
چاندنی چھٹکی ہوئی میرے سیہ خانے میں ہے

انقلابِ دہر کا غم مجھ کو اے ساقی نہیں
گردشِ ہفت آسماں اک تیرے پیمانے میں ہے

اس نے دورِ حُسن دیکھا تھا سرِ بزمِ ازل
ہے وہی مستی جو اب تک میرے مستانے میں ہے

یہ رہے مدِ نظر اے بادہ خوارِ زندگی
نیستی کا دور بھی ہستی کے پیمانے میں ہے

ظاہری اسباب سے اس کو تعلق کچھ نہیں
حق پرستی کے لئے بسمل بھی بُت خانے میں ہے

۲۴؍ اگست ۱۹۳۰ء

حسب فرمائش منشی رام لال صاحب رئیس کرشن گنج۔ الٰہ آباد

بتائے موت ہی تشریح موت کی کیا ہے
سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ زندگی کیا ہے

ابھی رموزِ حقیقت سے میں نہیں واقف
خودی سے پوچھ رہا ہوں کہ بے خودی کیا ہے

ہزار رنگ کے جلوے ہزار رنگ میں ہیں
نظر کرے نہ کمی تو مجھے کمی کیا ہے

فنا کا راز بشر پر کھلے گا مشکل سے
تمام عمر نہ سمجھا کہ زندگی کیا ہے

وہ مجھ سے خوش رہیں مجھ سے کبھی نہ ہوں ناخوش
یہی خوشی ہے مری اور اب خوشی کیا ہے

کسی کا عشق نہیں غم نہیں خیال نہیں
جو یہ خودی ہے سمائی تو بے خودی کیا ہے

جو اُن سے شکوۂ بیداد و جور کرتا ہوں
تو کس ادا سے یہ کہتے ہیں وہ ابھی کیا ہے

وہ دیکھ جائیں مجھے موت سے جو ڈرتے ہیں
کہ مر رہا ہوں ہرا لطفِ زندگی کیا ہے

وہ رنگِ حسن تغزّل کو جانتے ہی نہیں
جو کہہ رہے ہیں کہ بسملؔ کی شاعری کیا ہے

۱۱ر نومبر ۱۹۲۹ء

حسب فرمائش مسٹر جی۔پی سریواستو، بی۔اے، ایل ایل۔بی، گونڈہ

جو تیغِ یار کے قابل نہیں ہے کلیجہ وہ نہیں ہے دل نہیں ہے

کسی قابل ہمارا دل نہیں ہے بجا ہے آپ کے قابل نہیں ہے

یہ کیا کہتے ہو دل کو دل نہیں ہے تمھاری یاد سے غافل نہیں ہے

سمجھتی ہے جسے دُنیا قیامت وہی تو آپ کی محفل نہیں ہے

ہم اپنے دل کو دل سمجھے ہوئے ہیں ہمارا دل تو کوئی دل نہیں ہے

ہماری نیستی ہستی سے اچھی اگر جینے کا کچھ حاصل نہیں ہے

یہ ارماں سب کو ہم منزل پہ پہنچیں مگر کوئی سرِ منزل نہیں ہے

اگر دل ہے تو دل میں ہے محبّت محبت پھر کہاں جب دل نہیں ہے

سمجھتے تھے کہ دُنیا ہوگی دُنیا مگر دُنیا کسی قابل نہیں ہے

زمانے سے بہت ہیں آپ غافل زمانہ آپ سے غافل نہیں ہے

یہ مانا بزمِ قاتل میں ہے دُنیا
مگر کیا ہے اگر بسملؔ نہیں ہے

۱۴؍اپریل ۱۹۲۱ء

بادۂ حُسن اور مستی ہے — واہ کیا شانِ خود پرستی ہے
ذوقِ کامل میں لُطفِ ہستی ہے — بُت پرستی خدا پرستی ہے
بعد مٹنے کے امتیاز کہاں — نہ بلندی ہے وہ نہ پستی ہے
مِٹ گئے ولولے جوانی کے — اب نہ وہ جوش ہے نہ مستی ہے
چھوڑ کر دیر ہم کہاں جائیں — اپنی قسمت میں بُت پرستی ہے
نیستی کہتی ہے جسے دُنیا — در حقیقت وہ اپنی ہستی ہے

اِس زمانے میں حضرتِ بسمؔل
عشق کیا ہے ہوس پرستی ہے

۵؍اپریل ۱۹۲۵ء

دُکھ بھری میری کہانی یاد ہے — ہر کسی کو یہ زبانی یاد ہے
چل بسی وہ چلتی پھرتی دھوپ چھاؤں — یاد ہے مجھ کو جوانی یاد ہے
بھول بیٹھے کچھ ہم اپنا واقعہ — کچھ محبّت کی کہانی یاد ہے
اہلِ غم روتے ہیں جوئے شیر پر — کوہ کن کی جاں فشانی یاد ہے
اک پریشاں خواب دیکھا تھا کبھی — اِس قدر ہم کو جوانی یاد ہے
دل ہمارا بھولنے والا نہیں — اُن کی ایک ایک مہربانی یاد ہے

حضرتِ بسمؔل ابھی بھولے نہیں
تیغِ قاتل کی روانی یاد ہے

۲۳ر فروری ۱۹۳۰ء

مشاعرہ ڈی۔ اے۔ وی اسکول الہ آباد

ہل چکا محفل میں اب لطفِ شکیبائی مجھے
کھینچتی ہے اپنی جانب تیری انگڑائی مجھے

بعد مرنے کے جو حاصل ہوگی رسوائی مجھے
زندگی کیا سوچ کر دُنیا میں تُو لائی مجھے

عشق میں یوں حُسن کی صورت نظر آئی مجھے
وہ تماشہ بن گئے کہہ کر تماشائی مجھے

خود پکار اُٹھتا جنوں تکمیلِ وحشت ہوگئی
وہ سمجھ لیتے جو دل میں اپنا سودائی مجھے

ہوگیا کہرام برپا خانۂ صیّاد میں
بیٹھے بیٹھے آشیاں کی یاد جب آئی مجھے

کل تھا میں کعبے میں موجود آج بُت خانے میں ہوں
چین دیتا ہی نہیں شوقِ جبیں سائی مجھے

آئینہ بھی تھا کوئی کیا زندگی کا آئینہ
دیکھنے پر موت کی صورت نظر آئی مجھے

زندگی کی کشمکش سے دست کش ہونا پڑا
نزع میں یاد آگئی جب اُن کی انگڑائی مجھے

کھُل گئی چشمِ بصیرت خاک میں ملنے کے بعد
دل کے ہر ذرّے میں اک دنیا نظر آئی مجھے

حضرتِ بسمل یہ اچھی دل کو سوجھی دل لگی
کردیا شمشیرِ قاتل کا تمنّائی مجھے

مشاعرہ کانپور - ۹ نومبر ۱۹۲۶ء

دل رہ نوردِ اُلفت گُم کردہ کارواں ہے
منزل سے کیوں نہ پوچھے منزل مری کہاں ہے

روزِ ازل سے اب تک گردش میں آسماں ہے
حیرت ہے مجھ کو قائم کیوں میرا آشیاں ہے

راہِ طلب میں کوئی مجھ کو نہیں بتاتا
مَیں سب سے پوچھتا ہوں جانا مجھے کہاں ہے

مَیں قید ہوں قفس میں اب کس طرح بچاؤں
بجلی کا رُخ اُدھر ہے جس رُخ پر آشیاں ہے

افشائے رازِ غم سے کھُل جائے گی حقیقت
جو میری داستاں ہے وہ تیری داستاں ہے

اے رہ روانِ اُلفت ہشیار رہ زنوں سے
فریاد ہے جرس کی خطرے میں کارواں ہے

بے فکرِ غم بنایا وارفتگی نے مجھ کو
مَیں کون ہوں کہاں ہوں ہوش اب کہاں ہے

لکھ دی تھی کیا خدا نے قسمت میں جبہہ سائی
ہم ہیں ہمارا سر ہے وہ سنگِ آستاں ہے

مَیں موت و زندگی کا مطلب سمجھ رہا ہوں
یہ عیش کی کہانی وہ غم کی داستاں ہے

یہ شوقِ خودنمائی وہ ذوقِ خود فروشی
پردے کا رہنے والا پردے میں اب کہاں ہے

کیا کیا مکاں کو رونق آزار و غم نے بخشی
بجلی کے دَم سے روشن بُلبل کا آشیاں ہے

مَیں غور سے نہ دیکھوں ذراتِ دل کو کیوں کر
لکھی ہوئی انھیں پر اُلفت کی داستاں ہے

فیضِ اساتذہ سے لیتا ہوں کام بسملؔ
دعویٰ نہیں یہ مجھ کو اُردو مری زباں ہے

مشاعرہ بہرائچ ۲۵ رمئی ۱۹۲۵ء

نہ دل کی فکر نہ دل بر کی جُستجو کرتے
یہ آرزو تھی کہ ہم ترکِ آرزو کرتے

مزا تھا ہم یونہیں تکمیلِ آرزو کرتے
تری تلاش میں اپنی بھی جستجو کرتے

مآلِ جلوۂ دیدار کیا ہوا موسیٰ
تم اُن سے پردے ہی پردے میں گفتگو کرتے

مری طرف سے نظر پھیر لی محبت کی
وہ کچھ نہ کرتے مگر قدرِ آرزو کرتے

دمِ اخیر زباں اپنی بند ہے لیکن
وہ ایسے وقت بھی آتے تو گفتگو کرتے

رہا نگاہ کے آگے کبھی حرم کبھی دَیر
کہاں کہاں پھرے ہم اُن کی جُستجو کرتے

دمِ اخیر مریضوں سے پُوچھ گچھ کیسی
یہ چل چلاؤ میں کیا تم سے گفتگو کرتے

خدا اگر دلِ بے مدّعا ہمیں دیتا
خدائی بھر میں نہ ہم اُن کی جستجو کرتے

ضرور حُسن کا یہ مُعجزہ دکھانا تھا
خموش رہ کے وہ دُنیا سے گفتگو کرتے

زمانے بھر میں تو مشہور ہو گئے بسمل
ہم اِس لئے نہیں شُہرت کی آرزو کرتے

مشاعرہ لکھنؤ ۔ ۱۹ نومبر ۱۹۲۷ء

بے پردہ کبھی اور کبھی پردہ نشیں ہے
وہ شوخ کسی وضع کا پابند نہیں ہے

مَیں کیوں اِسے تسلیم کروں پردہ نشیں ہے
پردے کا تو ہے نام وہ پردے میں نہیں ہے

یوں پردے میں پوشیدہ کوئی پردہ نشیں ہے
ہوتا نہیں معلوم مجھے ہے کہ نہیں ہے

وہ دیدۂ خود بیں کو نظر آ نہیں سکتا
آئینۂ ادراک میں جو ذہن نشیں ہے

پابندِ قفس ہوں مگر اے گردشِ گردوں
پھرتی مری آنکھوں میں گلستاں کی زمیں ہے

بے چین ہیں وہ جلوہ فروشی کے لئے خود
لیکن کوئی اب دیکھنے والا ہی نہیں ہے

اب جاؤں کہاں کوچۂ جاناں سے نکل کر
جینا بھی یہیں ہے مجھے مرنا بھی یہیں ہے

معلوم رہے تم کو یہ اے حضرتِ زاہد
مندر میں نہیں وہ تو حرم میں بھی نہیں ہے

اب رہ نہ گیا کچھ مرے مرنے میں توقف
وہ آ میں چلے آئیں دمِ بازپسیں ہے

پردیس میں تو ہوتی ہے توقیر بہت کچھ
بسملؔ کی مگر قدر وطن ہی میں نہیں ہے

۱۴ جولائی ۱۹۲۶ء

رسالہ زمانہ کانپور کے لئے یہ غزل کہی گئی تھی۔

دُنیا کا تماشہ کچھ بھی نہیں دُنیا کا تماشا دیکھ چُکے
آغازِ تمنّا دیکھ چُکے انجام تمنّا دیکھ چُکے

ہم رہ کے کریں کیا دُنیا میں اب منظرِ دُنیا دیکھ چُکے
مرنے کا تماشا دیکھیں گے جینے کا تماشا دیکھ چُکے

لائے تھے کہ دل لے گا کوئی محروم مگر ہم جاتے ہیں
بازار میں سودا ہو نہ سکا بازار کا سودا دیکھ چُکے

ہاتھوں سے نہ اپنے مٹی دی آئے نہ کبھی وہ مرقد پر
مرنے کی بہت حسرت تھی ہمیں مرنے کا تماشا دیکھ چُکے

عالم ہے نرالا اُلفت کا صورت ہے نرالی اُلفت کی
دُنیا سے الگ دُنیا سے جُدا دُنیا میں یہ دُنیا دیکھ چُکے

کُل ہائے مقاصد کھل نہ سکے اس کاوشِ پیہم پر اب تک
ہم دل میں چُبھو کر تجھ کو بھی اے خارِ تمنّا دیکھ چُکے

عالم سے وہ کتنے چھپتے ہیں سو پردوں میں چُھپ کر رہتے ہیں
دُنیا میں مگر دُنیا والے سو بار تماشا دیکھ چُکے

چلمن سے کبھی ظاہر ہونا چلمن میں کسی دن چُھپ جانا
یہ پردہ بھی کوئی پردہ ہے ہم آپ کا پردا دیکھ چُکے

یہ خونِ وفا نے کام کیا وہ خون کے آنسو روتے ہیں
بسملؔ کے تڑپنے لوٹنے کا جی بھر کے تماشا دیکھ چُکے

۱۷ جنوری ۱۹۲۲ء

طبع زاد

ساز ہستی کا عجب جوش نظر آتا ہے
اک زمانہ ہمہ تن گوش نظر آتا ہے

حسرتِ جلوۂ دیدار ہو پوری کیوں کر
وہ تصوّر میں بھی روپوش نظر آتا ہے

دیکھتے جاؤ ذرا شہرِ خموشاں کا سماں
کہ زمانہ یہاں خاموش نظر آتا ہے

آپ کے نشترِ مژگاں کو چبھو لیتا ہوں
خونِ دل میں جو کبھی جوش نظر آتا ہے

آپ ہی صرف جفاکوش نظر آتے ہیں
سارا عالَم تو وفاکوش نظر آتا ہے

موسمِ گُل نہ رہا دل نہ رہا جی نہ رہا
پھر بھی وحشت کا وہی جوش نظر آتا ہے

شانۂ یار پہ بکھری تو نہیں زُلفِ دراز
ہر کوئی خانماں بردوش نظر آتا ہے

جلوۂ قدرتِ باری کا مُعمّہ نہ کھُلا
روبرو رہ کے بھی روپوش نظر آتا ہے

پھر ذرا خنجرِ قاتل کو خبر دے کوئی
خونِ بسمل میں وہی جوش نظر آتا ہے

۱۲/ اکتوبر ۱۹۲۴ء

حسبِ فرمائش بابو گوری شنکر صاحب الہ آباد

آبرو عشق میں پائے کسی قابل ہو جائے
دل سے جس دل کو وہ دل کہہ دیں وہی دل ہو جائے

گرمیِ شمع ترا رُخ جو سوئے دل ہو جائے
ابھی جل بھُن کے یہ پروانۂ محفل ہو جائے

لذّتِ زخمِ ستم یوں مجھے حاصل ہو جائے
ہو جدھر تیر ترا دل سے اُدھر دل ہو جائے

نام روشن کرے اب وحشتِ وفا میں اپنا
دل نذر ہو کے چراغِ سرِ منزل ہو جائے

ذرّہ کوچۂ غم کو ہے یونہیں بے تابی
تم جو رکھ دو قدم اُس پر ہمہ تن دل ہو جائے

شمعِ قدرت یہی کہتی تھی سرِ بزمِ ازل
جس کو جلنا ہو وہ پروانۂ محفل ہو جائے

نزع کے وقت وہ بالیں سے تو اُٹھتے ہیں مگر
کہیں ایسا نہ ہو مرنا مرا مُشکل ہو جائے

اور کیا ہے یہ ہے ترتیبِ عناصر سے غرض
ہو جو آزاد وہ پابندِ سلاسل ہو جائے

ہے مری وجہ سے یہ حُسن یہ زینت یہ بہار
مَیں جو اُٹھ جاؤں تو سونی ابھی محفل ہو جائے

مَوت اچھی ہے غمِ عشق میں مرنا اچھا
جی کے وہ کیا کرے جینا جسے مُشکل ہو جائے

سُننے والا جو سُنے دل سے کلامِ بسملؔ
میرا دعویٰ یہ ہے وہ صورتِ بسمل ہو جائے

۲۱ ر اکتوبر ۱۹۲۹ء

حسب فرمائش عزیزی بابو ہریش چندر ضیاؔ دیوانند پوری بی۔اے، ایل ایل۔بی،

دل میں طرح طرح کی تمنّا لئے ہوئے
بیٹھا ہوں ذوق و شوق کی دُنیا لئے ہوئے

اک اک قدم پہ جلوۂ جاناں ہے ساتھ ساتھ
مَیں پھر رہا ہوں طوُر کا نقشا لئے ہوئے

جاتا ہوں بار بار اُسی جلوہ گہ کی سمت
آنکھوں میں حسبِ شوق تمنّا لئے ہوئے

محشر میں دیکھنا ہے مجھے اُن کا حشر بھی
آئے ہیں حسرتوں کی جو دُنیا لئے ہوئے

جوشِ جنوں میں ہیں یہ تصوّر کی خوبیاں
مجنوں ہے اپنی گود میں لیلا لئے ہوئے

آنے میں سَو حجاب بُلانے میں سَو خیال
چھپتا ہے کوئی حُسن کی دُنیا لئے ہوئے

یہ بات ہے محال کہ محشر میں جائیں ہم
اپنی زبان پر ترا شکوا لئے ہوئے

اک تُو نہ ہو خلاف زمانہ رہے خلاف
بسملؔ ہیں اپنے ساتھ میں دُنیا لئے ہوئے

---
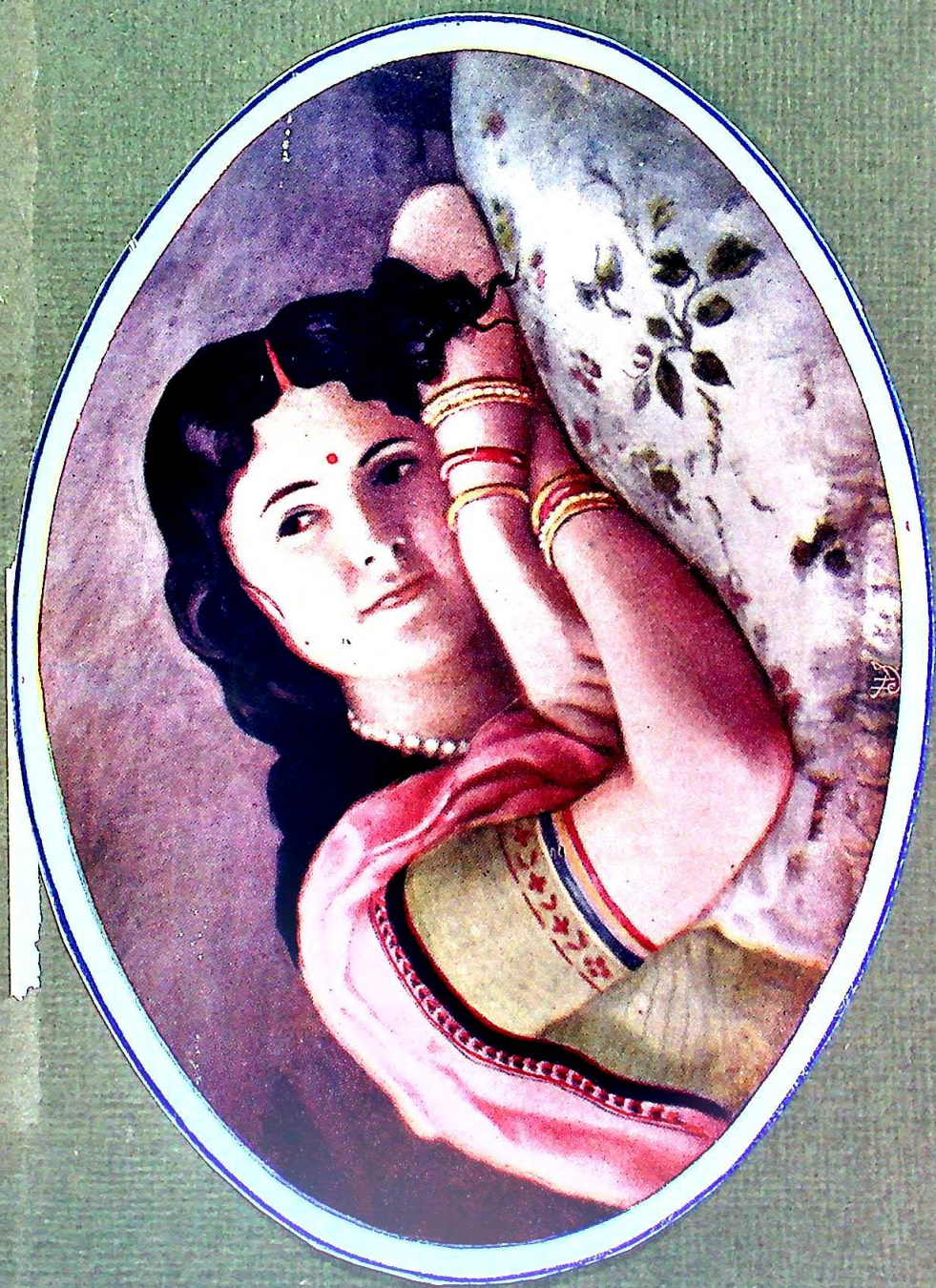
۱۷ اگست ۱۹۴۹ء

حسب فرمائش بابو اودھ کشور پرشاد صاحب گشتہ بی اے۔ بی ایل، گیا وی

کیا کریں اُن پر تصدق ہم کہ مشکل ایک ہے
کہنے سُننے کو ہیں دو پہلو مگر دل ایک ہے

اہلِ دل نے بعد مدت کے کیا یہ فیصلہ
حُسن ہو یا عشق ہو دونوں کا حاصل ایک ہے

کر دیا بحرِ فنا نے یوں اسیرِ موجِ غم
ڈوبنے والے کو اب دریا و ساحل ایک ہے

جادۂ اُلفت سے پائے شوق اُٹھ سکتا نہیں
مَیں سمجھتا ہوں کہ میں ہوں ایک منزل ایک ہے

نامرادِ عشق جب میں ہوں تو کیا لطفِ حیات
میرے جینے اور مر جانے کا حاصل ایک ہے

مجھ کو بیٹھی ہیں ہزاروں آرزوئیں گھیر کر
کس طرح دل میں جگہ مَیں دوں مرا دل ایک ہے

اہلِ عالم پر ہُوا رنگیں بیانی کا اثر
ماننا سب کو پڑا اندازِ بسمل ایک ہے

جذباتِ بسمل

ظرافت

ظرافت
اخلاقی۔ ملکی۔ معاشرتی

وہ فرماتے ہیں تجھ کو رنگ ہی لانا نہیں آتا
ڈنر میں ساتھ سب کے بیٹھ کر کھانا نہیں آتا

کبھی پوچھے ستم کیا ہے کبھی پوچھے کرم کیا ہے
جو ایسا نا سمجھ ہے اُس کو سمجھانا نہیں آتا

اب اِس کی بحث ہی کیا ہے نہ وہ آئیں نہ ہم جائیں
اُنھیں آنا نہیں آتا ہمیں جانا نہیں آتا

اُسے دُنیا کہے قاتل مگر ہم کہہ نہیں سکتے
جسے اچھی طرح بسملؔ کو تڑپانا نہیں آتا

اِسے قربان اُسے چاہنے والا پایا
ہم نے ایک ایک کو بس طالبِ دُنیا پایا

دہشت و خوف کے باعث سے زباں بھی نہ کھلی
مَیں نے گردن میں جو قانون کا پھندا پایا

اپنی ہی عقل پہ موقوف ہے عالم کی شناخت
ہم نے جیسا جسے سمجھا اُسے ویسا پایا

میں جو دربار سے نکلا تو جناب بسملؔ
پوچھا ایک ایک نے یہ مجھ سے کہو کیا پایا

رہا جو دوست برسوں دوستی کا حق نہیں سمجھا
اُسے دشمن سمجھ کر ئیں تو مارِ آستیں سمجھا

ہزاروں لفظ ایک ایک لفظ میں بھی سیکڑوں معنی
تمھاری بات سب سمجھے مگر میں تو نہیں سمجھا

کسی کا ڈر نہیں یہ برملا کہتا ہوں اے بسمل
جو مجھ کو کچھ نہیں سمجھا اُسے میں کچھ نہیں سمجھا

ہم کو مرنے کے سوا خلق میں چارا کیا تھا
تھی قضا سر پہ تو جینے کا سہارا کیا تھا

دیکھتے دیکھتے وہ بن گئے گھر کے مالک
اب یہ فرماتے ہیں ہم سے کہ تمھارا کیا تھا

نہ تو سروس کی تمنا ہے نہ پروائے ڈِگر
آپ سے حضرتِ بسمل کو سہارا کیا تھا

غنچۂ دل کا بہر طور ہے کھلنا اچھا
کام نکلے تو ہے سرکار سے ملنا اچھا

صفحۂ دہر سے مٹ جائے نفاق اے بسمل
ہو غلط حرف تو اُس حرف کا چھلنا اچھا

تھاہ بحرِ غمِ اُلفت کی کوئی پا نہ سکا
جو ہوا غرق کنارے پہ وہ پھر آ نہ سکا
اُس کو سمجھاتے ہو کس واسطے تم اے بسملؔ
کہ زمانے میں زمانہ جسے سمجھا نہ سکا

کہیں گھر کو نہ اپنے بھول جانا　　سمجھ کر سوچ کر اسکول جانا
کوئی یہ باغ میں پھولوں سے کہہ دے　　بُرا ہے رنگ و بُو پر پھُول جانا
خودی میں لُطف کیا اُلفت کا بسملؔ　　تمھیں لازم تھا خود کو بھُول جانا

وہ اور کیا بتائے دُنیا میں کام اپنا
آتا ہے برہمن کو بس رام رام جپنا
بنگلوں پہ جاکے بسملؔ کرنے لگے خوشامد
مطلب یہ ہے کہ سمجھیں وہ خیر خواہ اپنا

دل کو حسرت نہ رہی سر کو وہ سودا نہ رہا
مختصر یہ ہے کہ اب عشق ہمارا نہ رہا
کیا سمجھ بوجھ کے دُنیا کے تماشائی ہوں
دل بہلنے کے لئے کوئی تماشا نہ رہا
وہی جلوہ ہے وہی حُسن وہی برقِ جمال
ہاں یہ کہئے کہ کوئی دیکھنے والا نہ رہا
پھیر لیں آپ نے بھی اُس کی طرف سے آنکھیں
اب تو بسملؔ کا کوئی پوچھنے والا نہ رہا

روا ہے بلبلِ شیدا چمن کے واسطے مرنا
وطن کے واسطے جینا وطن کے واسطے مرنا
وطن سے دُور کیا پردیس جائیں حضرتِ بسمل
نہیں بہتر کہیں دو گز کفن کے واسطے مرنا

خیال آتا ہے دل میں کب ہمارا
نہیں کیوں ہم سے وہ مطلب ہمارا
ہمیں ہے اُنس ہر مذہب سے بسمل
نہیں ہے کوئی بھی مذہب ہمارا

مدّعا نام ہے کس چیز کا مطلب کیسا
ہے نیا رنگ نیا ڈھنگ نیا ڈھب کیسا
پوچھے مذہب کے یہ دیوانوں سے کوئی بسمل
جس سے جھگڑا اُٹھے آپس میں وہ مذہب کیسا

آخر کو مجھے موت کے قانون نے گھیرا
ہیضے سے بچی جان تو طاعون نے گھیرا

وہ اس کا راز سمجھا وہ اِس کا پیچ سمجھا
دُنیا میں جس نے رہ کر دُنیا کو ہیچ سمجھا

یہ ہر پہلو سے بہتر ہے یہی ہے بالیقیں اچھا کہ مرنا جلد اچھا ہے بہت جینا نہیں اچھا

حضرتِ دل آپ ہیں نادان ہم سمجھائیں کیا
غم ہی جب ملتا ہے کھانے کو تو کھانا کھائیں کیا

ملیں گے ہم تو بڑے صاحب سے کام نکلے گا
کہ پائنیر میں ہمارا بھی نام نکلے گا

مدعا تھا پیٹ بھرنے سے وہ حاصل ہوگیا
یعنی انگلش پڑھ کے میں دفتر میں داخل ہوگیا

میں نے دیکھا پائنیر میں آج اک مضمون تھا
نام کو مضمون تھا اور اصل میں قانون تھا

سہل لکھ لکھ کر یہ کیا اچھا تماشا کر دیا
حضرتِ بسمل نے تو اردو کو بھاشا کر دیا

بہ رنگِ نکہتِ گلشن پریشانی سے کیا مطلب
مجھے سیرِ بہارِ عالمِ فانی سے کیا مطلب
رلاتا میں نہیں محفل میں روتوں کو ہنساتا ہوں
غزل گوئی سے مطلب مرثیہ خوانی سے کیا مطلب
ہمیشہ بیٹھتے اٹھتے غرض ہے فوج داری سے
جو دیوانہ ہے بسمل اس کو دیوانی سے کیا مطلب

بیٹھے کرسی پہ تو کرنے لگے اِسٹول کی بات یاد کالج میں اُنھیں آگئی اسکول کی بات
اور بھی بلبل بے کس کو اذیّت ہو گی گھر میں صیّاد کے چھیڑے نہ کوئی پھول کی بات
آنکھ رکھتے ہو تو نظّارہ کرو اے بسملؔ
کان اگر ہے تو سُنو بندۂ مقبول کی بات

ہر گھڑی بیٹھتے اُٹھتے ہے وہی نام کی بات
بات تو جب ہے کریں آپ کوئی کام کی بات

دُور رہے صحنِ چمن سے گر کے پتّی کی طرح
قوم پگھلی جا رہی ہے موم بتّی کی طرح

کیا کیجئے گا حالِ دلِ زار دیکھ کر مطلب نکال لیجئے اخبار دیکھ کر

کام کرنا ہم کو آیا کام کرنا دیکھ کر
پانوٗں کا پڑنا تھا لازم پانوٗں دھرنا دیکھ کر
وقتِ آخر کر سکے کچھ بھی نہ احباب و عزیز
ہاتھ مَلتے رہ گئے بسملؔ کا مرنا دیکھ کر

بُت صدا دیتے ہیں یہ پاپ ہے تو پاپ نہ کر
یعنی مندر میں دکھانے کے لئے جاپ نہ کر

مجھے پسند نہ آئی جو میم کی آواز تو ہر طرف سے اُٹھی شیم شیم کی آواز

یہ کس نے کہہ دیا کہ زمانے سے بَیر کر
دُنیا میں آگیا ہے تو دُنیا کی سَیر کر

ہو گیا ناچار میں مجبوریِ دل دیکھ کر　　خضر چلتے ہو گئے کالج کی منزل دیکھ کر

پڑھ کر انگریزی وہ بیٹھیں کس کے پہلو کی طرف
آپ ہندی کی طرف ہیں میں ہوں اُردو کی طرف
کانپ اُٹھے جسم سارا پھول جائیں ہاتھ پائوں
دیکھ لیں صاحب اگر غصّے سے بابو کی طرف

لیڈر کا رونا ایک طرف پبلک کا رونا ایک طرف
دونوں کا اثر کیا رکھتا ہے سرکار کا ہونا ایک طرف
وہ قدر نہیں کچھ بھی کرتے، کچھ بھی نہیں اُن کی نظروں میں
جان اپنی کھوتی ایک طرف، مال اپنا کھونا ایک طرف
ہنستا ہے زمانہ دل میں اسے سوچو تو سہی سمجھو تو سہی
اے شیخ و برہمن اب رکھو مذہب کا رونا ایک طرف
عالم سے نہیں کچھ ہو سکتا پتھر کی لکیر اِس کو سمجھو
دُنیا کا ہونا ایک طرف سرکار کا ہونا ایک طرف
کیا منظرِ عبرت یہ بھی ہے دُنیا کے لئے عالم کے لئے
قاتل کا ہنسنا ایک طرف بسمل کا رونا ایک طرف

منتقل ہو کر رہے صاحب بھلا کس کی طرف
یہ کبھی اُس کی طرف ہیں یہ کبھی اِس کی طرف
مجھ سے پوچھو تو پتے کی بات میں کہہ دوں ابھی
جاگ اُٹھی اُس کی قسمت وہ ہوئے جس کی طرف
میرے نام آیا ہے اے بسمل یہ اک صاحب کا حکم
انڈین ہو کر نہ تم دیکھا کرو مِس کی طرف

رات کو دن دِن کو وہ یوں رات کرتے خوب ہیں
کام کم کرتے ہیں لیکن بات کرتے خوب ہیں
حضرتِ بسمل تو کیا قائل زمانہ ہو گیا
بندہ پرور بل کے سب سے گھات کرتے خوب ہیں

حق تو یہ ہے کوئی صورت حق نما ملتی نہیں
مَیں بھٹکتا ہوں مگر راہِ خدا ملتی نہیں
ڈاکٹر جھا[1] کے دواخانے میں ہے سب کچھ مگر
موت کی اے حضرتِ بسمل دوا ملتی نہیں

سرِ دربار کہتے ہیں ہم ایسے ہیں
ترقی قوم کی چاہیں جو دُنیا میں کم ایسے ہیں
کہیں کا بھی نہ رکھا ہم کو اِس ہم تو نے اے بسمل
یہی سب کی زباں پر ہے ہم ایسے ہیں ہم ایسے ہیں

---

[1] الہ آباد کے مشہور ڈاکٹر کرشنا رام صاحب جھا۔

رہ رو یہ کیوں کہیں کسی راہی کے ساتھ ہیں
دُنیا میں جس جگہ ہیں تباہی کے ساتھ ہیں
منزل کدھر ہے اِس پہ ہماری نظر نہیں
جو راہ میں ملا اُسی راہی کے ساتھ ہیں
بسمل ملے گا عیش زمانے میں مل چُکا
ہم ہیں تباہ حال تباہی کے ساتھ ہیں

بہارِ گُل کا عالم دیکھ کر سر اپنا دُھنتا ہوں
مری تقدیر میں کانٹے ہیں مَیں کانٹوں کو چُنتا ہوں
کہوں تو کیا کہوں ہے گو مگو کا حال اے بسمل
کوئی سُنتا نہیں میری مگر مَیں سب کی سنتا ہوں

وہ دُنیا بھر کو کہتے ہیں یہ ایسے ہیں وہ ایسے ہیں
مگر اُن سے کوئی پوچھے کہ سرکار آپ کیسے ہیں

کُرسی ٹیبل نہیں تو کچھ بھی نہیں
جزو سے کُل نہیں تو کچھ بھی نہیں
اب زمانے میں آدمی بسمل
فیشن ایبل نہیں تو کچھ بھی نہیں

کچھ لکھ نہیں سکتے ہیں بے کار نکلتے ہیں
کس واسطے پھر اتنے اخبار نکلتے ہیں

جیٹھ کی دوپہر میں تپتا ہوں　　پھر بھی صاحب کا نام جپتا ہوں
نام کو برگ و بار مجھ میں نہیں　　دیکھنا یہ ہے کب پنپتا ہوں
ہے تخلّص کا یہ اثر بسمل
دن ہو یا رات ہو تڑپتا ہوں

سمجھتے ہیں کہ سُرخی ہم بڑی معقول دیتے ہیں
ذراسی بات کو اخبار والے طول دیتے ہیں
کہیں کیا حال تم سے محفلِ عالم کا اے بسمل
جسے دیتے تھے کرسی اب اُسے اِسٹول دیتے ہیں

یہ اُن سے مَیں نہیں کہتا کہ دُشمنی نہ کریں
کبھی کریں وہ مرے ساتھ اِسے کبھی نہ کریں
بس ایک بات کہی تم نے حضرتِ بسمل
کہاں سے پیٹ بھریں سب جو نوکری نہ کریں

ہم دیکھ کے قسمت کو جبیں کوٹ رہے ہیں
بے بس وہ سمجھ کر جو ہمیں لوٹ رہے ہیں
ہندو بھی مسلمان بھی رستے سے بھٹک کر
میدانِ ترقّی کی سڑک کوٹ رہے ہیں
آپس کی لڑائی سے ہوا نفع یہ بسمل
رِشتے جو محبّت کے تھے وہ ٹوٹ رہے ہیں

بے اثر نالوں میں پہلے تم اثر پیدا کرو
ہے اگر مطلب کہ سب کے دل میں گھر پیدا کرو
یہ ہے بسملؔ خوب مصری[1] لال کا شیریں سخن
لُطف جینے کا تو جب ہے نام و زر پیدا کرو

تمھارے دور میں غم کھاتے ہیں اور اشک پیتے ہیں
مگر ہے زندگی مر مر کے ہم اِس پر بھی جیتے ہیں

جہاں میں حضرتِ بسملؔ ہمیشہ سب سے ملتے ہیں
جنھیں مطلب سے مطلب ہے وہی مطلب سے ملتے ہیں

گردشِ تقدیر سے راحت کہیں ملتی نہیں
باغ میں رہ کر بھی اب دل کی کلی کھلتی نہیں

کچھ لہو تن میں ہے باقی وہ پئے لیتے ہیں
جونک بن بن کے مری جان لئے لیتے ہیں

یہ سمجھ کر سوچ کر بھرئیے اثر مضمون میں
آپ نے کچھ لکھ دیا اور آ گئے قانون میں

اثر ہوتا اگر کچھ قوم کے شیون میں نالے میں
قدم کاہے کو رکھتے آ کے صاحب پاٹھ شالے میں

---

[1] لالہ مصری لال صاحب رئیس الٰہ آباد

آ گئے پنڈت بھی آخر آخر اُن کے رَول میں
پاٹھ شالہ چھوڑ کر داخل ہوئے اسکول میں

دین و دُنیا کا سبق اِن سے کوئی پاتا نہیں
نام کو پنڈت ہیں کچھ آتا نہیں جاتا نہیں

مولوی صاحب بجا کہتے ہیں قاضی کیا کریں
حال کا یہ حال ہو تو ذکر ماضی کیا کریں

یہ ہیں اندھیرے میں رہتے ہیں وہ اُجالے میں
بس اِتنا فرق ہے گورے میں اور کالے میں

لُطف لکھنے کا یہی ہے جا لکھیں بے جا لکھیں
جب نہ آزادی ہو تو اخبار والے کیا لکھیں

نہیں ہے اور کوئی شوق ہم کو عالم میں
ہمارا نام چھپے پانیر کے کالم میں

ہوش والے بھی سمجھتے ہیں یہی بے ہوش ہوں
کیا کروں میں رنگِ دُنیا دیکھ کر خاموش ہوں

یہ چاہتا ہوں کہ مَیں بھید آپ کا سمجھوں
سمجھ میں بات نہ آئے تو اُس کو کیا سمجھوں

دعوے تو ہیں ہزار مگر گُن کوئی نہیں

بے سُر کے گیت گاتے ہیں وہ دُھن کوئی نہیں

وقتِ آخر جان ہے کس صدمۂ جاں کاہ میں

ریل یا موٹر نہیں ملتی عدم کی راہ میں ۔

میم صاحب کی کمر آتی نہیں جب ہات میں

کس طرح ہم مل کے ناچیں بزمِ خوش اوقات میں

حکم حاکم سے کہاں ملتی ہے اے بسملؔ نجات

خوب کٹ پُتلی بنے ہیں دوسروں کے ہات میں

مَیں آبرو پسند نہ دولت پسند ہوں

ہاں یہ ضرور ہے کہ محبت پسند ہوں

بدنام کر رہے ہیں وہ بسملؔ کو ہر طرف

یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ شُہرت پسند ہوں

کلامِ بسملِؔ رنگیں بیاں کو منتخب سمجھیں

مزا کہنے کا تو جب ہے کہیں یہ اور سب سمجھیں

مجھ سے برگشتہ وہ نگاہیں ہیں　　ہر گھڑی میرے لب پر آہیں ہیں

ملنے والا ملے تو اے بسملؔ　　اُن سے ملنے کی لاکھ راہیں ہیں

کچھ کہہ سکیں نہ اُن سے تو ہم جی کے کیا کریں
ہر دم لہو کے گھونٹ یونہیں پی کے کیا کریں

بسمؔل ہجومِ غم سے ملی کس گھڑی نجات
جینا اگر یہی ہے تو پھر جی کے کیا کریں

ضبطِ غم کا نباہ کرتے ہیں
ہم کہاں دل سے آہ کرتے ہیں
دل میں سب آہ آہ کرتے ہیں
بولنے کا نہیں کسی کو حکم
ہم جو اِس پر نگاہ کرتے ہیں
نہیں جچتی نگاہ میں دُنیا
شاعری میری کچھ نہیں بسمؔل
لوگ کیوں واہ واہ کرتے ہیں

نخلِ اُلفت کاٹ کر بیٹھوگے کس کی چھاؤں میں
اپنے ہاتھوں سے نہ مارو تم کلھاڑی پاؤں میں

اُن کی آنکھوں کا اشارہ ہے کہ شکوا نہ کرو
جس میں کچھ لَے نہ ہو وہ راگ الاپا نہ کرو
جس سے جھگڑا ہو اُٹھے جس سے زمانے میں فساد
ایسے مضموں کبھی اخبار میں لکھا نہ کرو
تندرستی کی تمنّا ہے اگر اے بسمؔل
دن کو سویا نہ کرو رات کو جاگا نہ کرو

بے کار کے مضمون نہ بے کار نکالو
شُہرت کی تمنّا ہو تو اخبار نکالو
دم بھر کا وہ مہمان ہے اب دم نہیں باقی
بسمؔل کے لئے کس لئے تلوار نکالو

رہو غارت ہو محوِ نالہ و فریاد ہو جاؤ
اُنھیں پروا نہیں کُچھ اِس کی تم برباد ہو جاؤ
کلامِ بسمؔلِ رنگیں بیاں دیکھا نہیں تم نے
اگر بھولے سے بھی پڑھ لو تو پڑھ کر شاد ہو جاؤ

صیّاد کی سُنتے نہیں مالی کی تو سُن لو
آنکلے ہو جب باغ میں کچھ پھول ہی چُن لو
ہر بات میں ضِد اچھّی نہیں حضرتِ بسمؔل
دُنیا کہے جس بات کو اُس بات کو سُن لو

تم زہر کے گھونٹ اب پئے جاؤ جینے سے غرض ہے بس جئے جاؤ
دُنیا میں سکوت سب سے اچھّا کچھ بھی نہ کرو یہی کئے جاؤ
محبّت کی نہیں کوئی ضرورت جو وہ کہیں بس وہی کئے جاؤ
آئے ہو کلب میں آج بسمؔل
دو گھونٹ شراب تو پئے جاؤ

دِن کہے گا ایک دن یہ رات کو
کچھ نہ پوچھو پائنیرؔ کی بات کو

بات کوئی گھات سے خالی نہیں
ہم سمجھتے ہیں تمھاری بات کو

آج کل کے خوب ہیں سائنس داں
بھول بیٹھے ہیں خدا کی ذات کو

مُفت اے بسملؔ دُھنا کرتے ہو سر
کون سُنتا ہے تمھاری بات کو

اُن کا مطلب ہے طبیعت کا بدلنا سیکھو
ہے یہ قانون کہ قانون پہ چلنا سیکھو

حُبِّ قومی کے لئے کام یہ کرنا سیکھو
تم کو مرنا نہیں آتا ابھی مرنا سیکھو

پڑھ کر انگلش بھول بیٹھے باپ کو
دیکھتے ہیں اب وہ اپنے آپ کو

بدلا ہے جو رنگ کچھ نہ پوچھو — آپس کی یہ جنگ کچھ نہ پوچھو
ہر وقت نیا ستم نیا جور — ہم جی سے ہیں تنگ کچھ نہ پوچھو
بسملؔ کی ہے شاعری نرالی
یہ رنگ یہ ڈھنگ کچھ نہ پوچھو

لازم تجھے یہی ہے شمال و جنوب دیکھ
دُنیا میں رہ کے رنگ بھی دُنیا کا خوب دیکھ
بسمل سے کہہ گیا سرِ شام آفتابِ قوم
مَیں ڈوبتا ہوں اب مجھے وقتِ غروب دیکھ

ہو گئیں گلیاں بھی شامل شہر کی سڑکوں کے ساتھ
لڑکیاں پڑھنے لگیں کالج میں اب لڑکوں کے ساتھ

اُمنگ دل میں رہے جوشِ آرزو کے ساتھ
اگر جیو تو زمانے میں آبرو کے ساتھ

عُمر یاروں میں گذرتی نہیں پرہیز کے ساتھ
روز ہوٹل میں ڈنر کھاتے ہیں انگریز کے ساتھ
اُس کو حسرت ہے نہ مندر نہ بُتوں کی بسمل
برہمن چرچ میں ہے اک مس نوخیز کے ساتھ

یہ دُنیا کو نصیحت کر ہمیشہ زمانے سے محبّت کر ہمیشہ
نہ ہو ارماں نہ کوئی آرزو ہو تمنّا کر یہ حسرت کر ہمیشہ
عزیزوں کی عداوت پر بھی بسمل
مناسب ہے محبّت کر ہمیشہ

کوئی جاپان کوئی روس کے ساتھ اور مَیں آپ کے جلوس کے ساتھ

ہے عمل بھی شرط تجھ کو نامۂ اعمال دیکھ
حال کیوں غیروں کا دیکھ اپنا ہی پہلے حال دیکھ

آج دُنیا رکھتی ہے راہِ ترقّی میں قدم
پانوں تیرے کس طرف پڑتے ہیں اپنی چال دیکھ

جا کے یہ کہہ دے ذرا اے دردِ قاتل سے کوئی
حال بسمل کا بُرا ہے آ کر اُس کا حال دیکھ

بولے لیڈر بڑے غُرور کے ساتھ
کچُھ بھی ہو ہم تو ہیں حضور کے ساتھ

اُن کی ہر بات اب نرالی ہے
بولتے بھی ہیں تو غُرور کے ساتھ

کس لئے تم الگ ہو اے بسمل
ساری دُنیا تو ہے حضور کے ساتھ

کیا لطف مرگ و زیست کا اہلِ جفا کے ساتھ
بندوں کو چاہیئے کہ رہیں وہ خدا کے ساتھ

قہر ہے قہر جی سے ہلنا بھی
غُنچۂ دل کا اپنے کھلنا بھی

ذکر ہے کیا نباہ کا بسمل
اب تو مشکل ہے اُن سے ہلنا بھی

غلط ہے ختم آپس کی لڑائی ہو نہیں سکتی
کدورت آگئی دل میں صفائی ہو نہیں سکتی
خدا جانے کہاں پہنچا دیا لے جا کے منزل سے
چلو بیٹھو بھی تم سے رہ نمائی ہو نہیں سکتی
یہ سب کہنے کی باتیں ہیں یہ حیلے ہیں بہانے ہیں
ہمارے حق میں کچھ اُن سے بھلائی ہو نہیں سکتی
زمانہ جانتا ہے صُلح کُن مشرب ہمارا ہے
کسی سے ہم سے اے بسمل لڑائی ہو نہیں سکتی

دکھاتے ہیں تماشے کیا ترقّی کے زمانے بھی
نئی تہذیب پر لٹّو ہوے دل میں پُرانے بھی
بس اتنا یاد ہے اسکول کے لڑکوں کو اے بسمل
کبھی مکتب میں ہم پڑھتے تھے ہجّے بھی رَوانے بھی

اب نہ باقی رہ گیا جوش اب نہ مستی رہ گئی
خیر یہ بھی ہے غنیمت اپنی ہستی رہ گئی
سربلندی پا کے تم ساری بلندی لے اُڑے
میرے حصّے میں فقط پستی ہی پستی رہ گئی
نیستی نے ہر طرف عالم پہ قبضہ کر لیا
کہنے سُننے کے لئے دُنیا میں ہستی رہ گئی
مَیں نے دیکھا پھر کر اے بسمل جہاں میں ہر طرف
حق پرستی کی جگہہ ناحق پرستی رہ گئی

بے طرح پھر گئی نظر مِس کی — دیکھئے موت آئے کِس کِس کی
سب سُناتے ہیں بے تُکی بسملؔ — بات دُنیا میں ہم سُنیں کِس کی

پُن سے نفرت اور حسرت پاپ کی — خیر پبلک کیا منائے آپ کی
جاؤں کیا گنگا کا ساحل چھوڑ کر — لہر پیدا ہو گئی ہے جاپ کی
اب کے لڑکے کچھ سمجھتے ہی نہیں — آبرو جاتی رہی ماں باپ کی

حضرتِ بسملؔ ہوئی مشہورِ خلق
ہر غزل نوٹس تھی گویا آپ کی

کس قدر دُور بلندی سے ہے پستی میری — اہلِ ہستی کوئی ہستی نہیں ہستی میری

پاس بی۔ اے ہو کے شُہرت مل گئی — پڑھ چکے کالج میں دولت مل گئی

بات یہ مجھ کو پسند آئی جنابِ پوپ کی
اِس زمانے میں حکومت رہ گئی ہے توپ کی

جس نے کچھ بھی نہ قدر کی میری — اُس ستم گر سے دل لگی میری
غور فرمائیں دیکھنے والے — ختم ہوتی ہے زندگی میری
بیر رکھتا نہیں کسی سے مَیں — دشمنوں سے ہے دوستی میری

مَیں ہوں مشہورِ خلق اے بسملؔ
لے اُڑی مجھ کو شاعری میری

قانون نے کہا تری حسرت نکل چکی
بس اب قلم چلے گا وہ تلوار چل چکی
بسمل کا حال دیکھ کے چپ ڈاکٹر بھی ہیں
پرہیز ہے یہی تو طبیعت سنبھل چکی

راہ میں خوب مُلاقات ہوئی　　مل گئے آپ بڑی بات ہوئی
ختم جب رات ہوئی دن نکلا　　دن ہوا ختم تو پھر رات ہوئی
رات دن رونے سے ہے کام اِس کو　　چشم تر کیا ہوئی برسات ہوئی
یاد رکھّا اِنھیں برسوں اُس نے
جس کی بسملؔ سے ملاقات ہوئی

برگشتہ ہے زمانہ قسمت ہے اپنی کھوٹی
کھانے کو پیٹ بھر اب ملتی نہیں جو روٹی
تہذیبِ مُفلسی سے مَیں ڈر رہا ہوں بسملؔ
بن جائے گی کسی دن دھوتی بھی کیا لنگوٹی

یہ چوکیدار سے کہتا رہا کل گاؤں کا پاسی
تردّد کیا اگر روٹی ہو تازی دال ہو باسی
کرو تو غور اے بسملؔ حکومت کل جو کرتے تھے
بنے ہیں آج آ آ کر وہی دفتر میں چپراسی

مُنحرف رہتے ہیں مجھ سے دوست بھی غمخوار بھی
میرے فیوَر میں نہیں لکھتا کوئی اخبار بھی
حضرتِ بسملؔ نے دیکھا اب نیا سامانِ جنگ
توپ کے آگے تو رکّھی رہ گئی تلوار بھی

رَوانیوں میں یہ آگے نکل نہیں سکتی
قلم کے سامنے تلوار چل نہیں سکتی
ہزار سیچئے پَتّی نکل نہیں سکتی
کہ خشک شاخ کبھی پھُول پھل نہیں سکتی
سمجھ لیں آپ کہ بسملؔ بھی تھے یہاں موجود
سبھا میں دال کسی کی بھی گل نہیں سکتی

نظم میں یونہیں جو الفاظ تراشی ہوگی بالیقیں آپ کی بھی خانہ تلاشی ہوگی

دردمندِ عشق و اُلفت کو سزا مِلتی رہی
دَم میں اُس کے دَم رہا جب تک دوا مِلتی رہی
اُن کے بنگلے پر تھا نور آنکھوں میں دل میں تھا سُرور
روشنی بجلی کی بجلی کی ہَوا مِلتی رہی
دل لگانے کا نتیجہ مَیں یہی دیکھا کیا
زندگی میں مجھ کو مرنے کی دُعا مِلتی رہی
حضرتِ بسملؔ نے لُوٹے دردِ اُلفت کے مزے
مُفت اِن کو ڈاکٹر جھا[1] کی دوا مِلتی رہی

---

[1] الہ آباد کے مشہور ڈاکٹر کرشنا رام صاحب جھا۔

بے کار پی رہا ہوں دوا اسپتال کی　　پروا جو ڈاکٹر کو نہیں میرے حال کی

دل میں کسی طرح کی تمنّا نہیں رہی　　عالم کا رنگ دیکھ کے پروا نہیں رہی
وہ لوگ اب نہیں رہے دُنیا نہیں رہی　　بسملؔ مری زبان کُھلے یہ محال ہے

قضا آئے گی اپنے وقت ہی پر رُک نہیں سکتی
جُھکائے زندگی لاکھ اُس کو لیکن جُھک نہیں سکتی

خدا کے حکم سے ہر لحظہ سب کی سانس چلتی ہے
یہ وہ گاڑی ہے اسٹیشن سے پہلے رُک نہیں سکتی

کیا پامال اُن کو غم نے جن کا قول تھا بسملؔ
کسی کے سامنے گردن ہماری جُھک نہیں سکتی

اُن کی اِک اِک پالیسی ہے دشمنِ جانی مری
میرے دل کو خاک کر دے گی پریشانی مری

کیوں نہ آئے یاد بسملؔ مجھ کو دِلّی کا قیام[۱]
حضرتِ سائلؔ نے کی ہے خوب مہمانی مری

مانتا ہوں مَیں کہ شان و تمکنت کی بات تھی
چُپ ہوئے بسملؔ تو اِس میں مصلحت کی بات تھی

سرِ بالیں برہمن سے یہی کہتی قضا پہنچی
پلاؤ اِن کو گنگا جل گھڑی مرنے کی آ پہنچی

---

[۱] نواب بلبلِ المعظم سراج الدین احمد خاں صاحب سائلؔ دہلوی

حاضر ہے مری جان بھی موجود ہے سر بھی
لُطف آئے جو صاحب کی توجّہ ہو اِدھر بھی

تعلیم کا دروازہ ہوا اپنے لئے بند
آیا نہ بجز بے ہُنری کوئی ہُنر بھی

توقیر ہو صاحب جو کہیں مُنہ سے یہ کہہ دیں
آنر بھی ہے بسمل کے لئے اور ڈِنر بھی

غم تو اِس کا ہے کہ دل نے میری غم خواری نہ کی
دُشمنوں سے کیا گلہ جب یار نے یاری نہ کی
جانتا تھا مَیں کہ ہر شے ہے یہاں کی بے ثبات
رہ کے دُنیا میں کسی شے کی خریداری نہ کی

بول اُٹھا باغِ ہند کا مالی کاٹ ڈالو نفاق کی ڈالی
شعر کس کو سُنائیں اے بسمل کہ نہ اکبر رہے نہ اب حالی

دِل نے یہ اُن سے بات کہی کتنی دور کی میری رضا وہی ہے جو مرضی حضور کی

ہوئی جو اور سے کچھ اور ہیلتھ نیشن کی وہ بول اُٹھے کہ ضرورت ہے آپریشن کی

دیکھ کر چلتی ہوئی بندوق ہمّت ہار دی
سر نہ اُٹھا تھا مرا ظالم نے گولی مار دی

جان آفت میں آئی بندے کی ہر طرف کھینچ کھانچ چندے کی

اِس سے ہو جاتی ہے ظاہر پالیسی سرکار کی
پڑھ لیا کرتا ہوں اکثر سُرخیاں اخبار کی

یہاں بھی چلنے لگیں اب ہوائیں فیشن کی
کہ بُت کدے میں وہ عزت نہیں برہمن کی

حق بجانب کہہ رہا ہوں تُم یہ کہنا مان بھی
میری نظروں میں ہیں یکساں وید بھی قرآن بھی
دیکھتے ہی دیکھتے بدلی یہ دُنیا کی ہوا
پر لگا کر اُڑ گیا اب دین بھی ایمان بھی
ڈھونڈھنے والوں کو بسملؔ جستجو کی شرط ہے
اُس کا مل جانا بہت مشکل بھی ہے آسان بھی

فکر دل میں ہر گھڑی اُس بات کی اِس بات کی
میں ہوں خوش کس بات سے مجھ کو خوشی کس بات کی

لیڈری کے لئے یہ گھات ہے دُنیا بھر کی کام تو کچھ بھی نہیں بات ہے دُنیا بھر کی

جس کو حسرت کام سے ہو جن کو حسرت نام کی ایسے لیڈر کیا اور ایسی لیڈری کس کام کی

ہم نہ ہوں گے نہ زمانے میں نشانی ہوگی
زندگی اپنی کسی روز کہانی ہوگی

کسی نے سیر زمانے کی سرسری کرلی
کسی نے لیڈری کرلی پلیڈری کرلی
شکم پُری کی تمنّا میں حضرتِ بسمل
جو ہم سے کچھ نہ بن آئی تو نوکری کرلی

قیمہ نہیں مِلتا ہمیں بوٹی نہیں مِلتی
رونا تو اب اس کا ہے کہ روٹی نہیں ملتی

ختم ہوگی جان لے کر یہ کسی انجان کی
آپ کی اسپیچ ہے یا آنت ہے شیطان کی

سمجھتے ہو غلامی سے ہمیں آزاد کردے گی
یہ دلچسپی تمھاری ایک دن برباد کردے گی

چرخے کی اب آتی نہیں کانوں میں صدا بھی
دو دِن کے لئے بندھ گئی کھدر کی ہوا بھی

قدر تو معلوم ہو جائے گی کُرسی میز کی
جی میں آتا ہے کریں ہم دوستی انگریز کی

بیانِ غم کیا کروں کسی سے یونہیں نکل جائے جان میری
ہوا ہے قانون پاس یہ بھی ہلے نہ مُنہ میں زبان میری

شوقِ نمود ہے تو سنوَرنا بھی سیکھئے
دریا میں غرق ہو کر اُبھرنا بھی سیکھئے
پیوندِ خاک ہو کے رہے خاک میں تو کیا
مٹی میں مل کر آپ سنوَرنا بھی سیکھئے
ہم کو پسند آگئی بسملؔ کی یہ صلاح
جینے کی آرزو ہو تو مرنا بھی سیکھئے

تعلیم کا اثر ہے جو سانچے میں ڈھل گئے
معلوم کیا نہیں تمھیں کیوں تم بدل گئے

سج رہا ہے آج گھر کس کے لئے
ہے یہ سامانِ ڈنر کس کے لئے
اُن کے بنگلے پر چلو ماتھا گھسیں
حضرتِ بسملؔ ہے سر کس کے لئے

شرطِ وفا میں جن کی جبیں سجدہ ریز ہے
جنّت سے بڑھ کر اُن کے لئے گول میز ہے

باغِ جہاں میں کلیوں کو کھلنا بھی چاہئے
ملنے سے کام نکلے تو ملنا بھی چاہئے
یہ وقت وہ نہیں کہ چلے بیٹھنے سے کام
اپنی جگہ سے آپ کو ہلنا بھی چاہئے

کچھ سڑک میں آ گئے گھر کچھ سڑک میں نپ گئے
اشتہارِ خانہ ویرانی گزٹ میں چھپ گئے
پیٹ کے دھندوں سے فرصت ہم کو ملنی ہے محال
سب سے اچھے وہ تھے جو دن رات ہر کو جپ گئے
آئے تھے جینے کی خاطر چار، چھ، دس، بیس دِن
سب تھے مرنے کے لئے آخر کو سب مر کھپ گئے

اشک آنکھوں میں بھرے رہتے ہیں فرطِ غم سے
مُفلسی قوم کی دیکھی نہیں جاتی ہم سے

کیوں سمجھ لیں کوئی لحظہ میں ہیں ہلنے والے
وہ کسی شرط پہ ہم سے نہیں ملنے والے
کہتے ہیں غنچۂ امّید جنھیں اے بسمل
ان ہواؤں سے وہ ہرگز نہیں کھلنے والے

دُنیا میں بھلائی کوئی کر کیوں نہیں جاتے — جب یہ نہیں کر سکتے تو مر کیوں نہیں جاتے

سمجھ والے یہ کہتے ہیں زمانہ کیا سمجھتا ہے — وہ ہے سب سے بُرا اپنے کو جو اچھا سمجھتا ہے

خلاف اپنوں سے ہو کر مُلک میں وہ جا بجا چمکے
چمکنا یہ نہیں اچھا جو یوں چمکے تو کیا چمکے

اِس قدر ہر آدمی کو کام کرنا چاہئے
کچھ نہ کچھ دُنیا میں رہ کر نام کرنا چاہئے
لوگ کہتے ہیں یہ عالم میں بہت ہیں نیک نام
حضرتِ بسمل کو اب بدنام کرنا چاہئے

فقط اِن مذہبی جھگڑوں سے رلتی سب کو روٹی ہے
نہ اب ڈاڑھی وہ ڈاڑھی ہے نہ اب چوٹی وہ چوٹی ہے
لڑے مرتے ہیں اے بسمل وطن والے جو آپس میں
اِسی سے ہو گیا معلوم قسمت اپنی کھوٹی ہے

بشر کو چاہئے ہر وقت نیک کام کرے
غرض یہ جینے سے دُنیا میں ہے کہ نام کرے
سلام دُور سے ایسے سلام کو بسمل
وہ چاہتے ہیں کہ دُنیا ہمیں سلام کرے

سبب یہی ہے ڈنر کا جو دھوم دھام سے ہے
کہ لوگ جانیں اُنھیں مطلب اُن کو کام سے ہے
کوئی بُرا کہے کہنے دو اُس کو اے بسمل
ہمیں زمانے میں تو کام اپنے کام سے ہے

ہم یہ ترکِ قصور کر نہ سکے   دل کو دُنیا سے دور کر نہ سکے
سب سے اکڑا کئے مگر بسمل   مَوت سے کچھ غرور کر نہ سکے

تنگ آ کر اُنھیں کے ہو بیٹھے ہم غلامی میں سب کو رو بیٹھے
وید سے واسطہ نہیں بسملؔ پڑھ کے کالج میں دین کھو بیٹھے

رہوں زمانہ میں کیوں کر زمانہ ساز ہیں سب
زمانہ کچھ نہیں دل ہٹ گیا زمانے سے
بیانِ دردِ جگر کیا کوئی تماشا ہے
کلیجہ کانپ اُٹھے گا مرے فسانے سے
بُری بلا میں پھنسے خیر اب نہیں بسملؔ
تمھارے نام سفینہ کٹا ہے تھانے سے

کون اُن کی بات سمجھے کون اُن کی بات جانے
ہُشیار وہ بڑے ہیں وہ ہیں بڑے سیانے
حاصل سکوں اگر ہے ملنے کا لُطف بھی ہے
کیا پھر کسی سے ملئے جب دل نہیں ٹھکانے
بسملؔ کسی سے ملنا کھُل کر ہو کیا گوارا
ہم تو یہ چاہتے ہیں دُنیا ہمیں نہ جانے

خاک ہونا ہے مجھے خاک کی ہستی کیا ہے
چار دن بعد بتا دوں گا کہ مستی کیا ہے
وہ بلندی پہ ہیں آج اُن کا ستارہ ہے بلند
اِس سے آگاہ نہیں کچھ بھی کہ پستی کیا ہے
نیستی سے اُنھیں آگاہ کروائے بسملؔ
جو سمجھتے ہی نہیں دل میں کہ ہستی کیا ہے

کیوں نہ بنگلے پر پھریں احباب اترائے ہوئے
جو کلکٹر تھے وہ بن کر لاٹ ہیں آئے ہوئے
اُردلی یہ کہہ کے لیتا ہے خبر ایک ایک کی
کیوں ہو بدلی کی طرح بنگلے پہ تم چھائے ہوئے
لوگ کہتے ہیں تڑپنے کو ہمارے دیکھ کر
تم ہو بسملؔ کیا کسی قاتل کے تڑپائے ہوئے

جس کو دیکھو محو سودل سے ضیا پاشی میں ہے
دیدۂ اہلِ خرد مصروف نقاشی میں ہے
حضرتِ بسملؔ نے یہ کیا خوب مصرع کہہ دیا
ہے اگر جنّت کہیں دُنیا میں تو کاشی میں ہے

دل میں وہ گرمی کہاں اب دل ہمارا سرد ہے
خون کی سُرخی کے غم میں رنگ رُخ کا زرد ہے
آتے جاتے بس وہی پامال کرنے سے غرض
آپ کی نظروں میں کیا بندہ سڑک کی گرد ہے
شاید ایسا ہو مگر ہم کو یقیں آتا نہیں
لوگ کہتے ہیں کہ بسملؔ شاعری میں فرد ہے

درسِ حق بھولے ہوئے ہیں کیا غضب کی بھول ہے
حافظے میں اُن کے یا کالج ہے یا اسکول ہے
فرش پر اب بیٹھنا تو داخلِ فیشن نہیں
بیٹھنے کے واسطے کُرسی ہے یا اسٹول ہے
شوق سے اخبار میں پڑھتے ہیں نیو لائیٹ کے لوگ
حضرتِ بسملؔ تمھاری شاعری مقبول ہے

چار دن کی زیست میں یہ کام کرنا چاہیئے
دوسروں کو فائدہ پہنچا کے مرنا چاہیئے

دُنیا کو چھوڑ بیٹھے فقط اِس کے واسطے
مسٹر ہیں بے قرار بہت مِس کے واسطے
بسملؔ کو بات چیت کی فرصت نہیں ہے اب
تیّار ہو رہے ہیں یہ آفس کے واسطے

مُنہ سے ہم کہتے ہیں بھگوان کا درشن مل جائے
اور ہے پیٹ کا یہ حکم کہ بھوجن مل جائے
کوئی ارمان نہیں اِس کے سِوا اے بسملؔ
اُن کے فیشن سے ہمارا کہیں فیشن مل جائے

تمھاری جو صدا ہے بے سُری ہے
کرو ترک اِس کو یہ عادت بُری ہے
وہ عادی ہو گئے کانٹا چھُری کے
وہاں کھانے میں بھی کانٹا چھُری ہے
جو کہتا ہوں وہ میں کہتا ہوں مُنہ پر
یہی تو مجھ میں ایک عادت بُری ہے
ہُوا جینا بہت دُشوار بسملؔ
ہمارا حلق ہے اُن کی چھُری ہے

پاٹھ شالے کا سبق سب بھول جانا چاہیئے
مختصر یہ ہے مجھے اسکول جانا چاہیئے
اُن سے پوچھو حضرتِ بسملؔ یہ کیا دستور ہے
مَیں نہ یاد آؤں تو مجھ کو بھول جانا چاہیئے

یہ عالم دیکھ کر دَم گھُٹ رہا ہے
کہ فیشن میں خزانہ لُٹ رہا ہے
پسے ہیں اس طرح قانون سے ہم
سڑک پر جیسے کنکر کُٹ رہا ہے
یہ کہہ کر بند کیں بسملؔ نے آنکھیں
ہمارا ساتھ سب سے چھُٹ رہا ہے

جو بے ہوشی کے عالم میں بھی قائم ہوش رکھتا ہے
ہمیں یہ دیکھنا ہے کس قدر وہ جوش رکھتا ہے
کہوں تو کیا کہوں نیرنگ عالم دیکھ کر بسملؔ
مجھے قانونِ قدرت ہر جگہ خاموش رکھتا ہے

الم ہے رنج ہے صدمہ ہے غم ہے
سہوں گا سب کو جب تک دَم میں دَم ہے
وہ ہم کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں
ہمارا مرتبہ اِس درجہ کم ہے
جو کہہ سکتے نہیں لکھتے ہیں اُس کو
ہمارے ہاتھ میں بسملؔ قلم ہے

دَوا تو ہو چکی بس اب دُعا سے مطلب ہے
مریضِ عشق کو ہر دم خدا سے مطلب ہے
ہر ایک سانس یہ کہتی ہے زندگی بسملؔ
بقا سے کچھ نہیں مطلب فنا سے مطلب ہے

مضمونِ محبّت کی یہ تمہید بڑی ہے
اُمّید یہ جیتا ہوں کہ اُمّید بڑی ہے
بسملؔ تمھیں کیا عرضِ تمنّا کی ضرورت
کچُھ بھی نہ کہو چُپ رہو تاکید بڑی ہے

اب اُبھرنے نہ کبھی دے گا مرا جوش مجھے
آپ قانون سے کرنے لگے خاموش مجھے
زیست کہتے ہیں جسے نیند ہے بے ہوشی کی
مَوت جب آئے گی تو آئے گا کچھ ہوش مجھے
دیکھ لیتا ہوں زمانے کی طرف اے بسملؔ
اب تڑپنے کا وہ باقی نہ رہا جوش مجھے

وہ بولے اگر زباں کھُلی ہے
قانون کی بھی دُکاں کھُلی ہے
بسملؔ نہ رُکے گی اب یہ ہرگز
محفل میں مری زباں کھُلی ہے

ستم پر ہم ستم لاکھوں سہیں گے   مگر ہر پھر کے گرجا میں رہیں گے
بدن میں خون تک باقی نہیں ہے   مری آنکھوں سے آنسو کیا بہیں گے
سبھا میں چُپ نہیں رہنے کے بسمل
کھری جو بات ہوگی وہ کہیں گے

تنگ ہوں جینے سے میں یہ کام کرنے دیجئے
ڈاکٹر صاحب سر کٹے مجھ کو مرنے دیجئے
وہ یہ کہتے ہیں تڑپنے سے تو مرنا خوب ہے
حضرتِ بسمل اگر مرتے ہوں مرنے دیجئے

پاجامے کی عزت نہیں پتلون کے آگے
کیوں بحث عبث ہم کریں قانون کے آگے
گرمی سے کوئی دم ہمیں راحت نہیں ملتی
شرما گئی دوزخ بھی مئی جون کے آگے
پامالیِ توقیر سے ڈرتے ہو جو بسمل
تو سر نہ اُٹھانا کبھی قانون کے آگے

ہر روز ہر گھڑی ہیں تباہی کے سامنے
آزار و رنج نامتناہی کے سامنے
بسمل اُنھیں تو اور کوئی پوچھتا نہیں
بندوں کی پوچھ گچھ ہے خدا ہی کے سامنے

دین والے کہہ رہے ہیں ہیچ ہے
لُطفِ دُنیا کچھ نہیں سب ہیچ ہے
جس کو فرصت ہو وہ سُلجھایا کرے
آپ کی ہر بات میں اک پیچ ہے
ہو چُکی بس ہو چُکی بسملؔ کی قدر
آپ کی نظروں میں بندہ ہیچ ہے

رنج سے وہ نجات پا جائے موت کی جس کو نیند آ جائے
جس جگہ پوچھ کچھ نہیں بسملؔ جا چُکا میں مری بلا جائے

خبر نہیں تمھیں دُنیا سرائے فانی ہے جو آج بات ہے کل تک وہی کہانی ہے
ملے گا لُطف ٹھہرنے کا خاک اے بسملؔ زمین موردِ آزارِ آسمانی ہے

دو دن جہاں میں رہ کے تماشا دکھا گئے
اے آنے جانے والو یہ کیا آئے کیا گئے
مٹّی کے ہم تھے مٹّی لکھی تھی نصیب میں
مٹّی میں لوگ اس لئے ہم کو ملا گئے
لاکھوں طرح کے ظُلم ہیں لاکھوں طرح کے غم
ہم کس خیال سے ترے کہنے میں آ گئے
اربابِ ذوق و شوق کو وجد آج آ گیا
بسملؔ کچھ اپنے شعر بھی آ کر سُنا گئے

کثرتِ غم میں بھی چہرے پر بحالی چاہیئے
سامنے نظروں کے تصویرِ خیالی چاہیئے

پڑھئے لیڈر میں یہ منشی[۱] جی کا اک نکلا ہے نوٹ
پاٹھ شالے کے لئے اِمداد مالی چاہیئے

پیڑ سوکھے جا رہے ہیں باغ میں بسملؔ مگر
لاٹ صاحب کے لئے نایاب ڈالی چاہیئے

دل عشق میں بدنام ہے رُسوا بھی بہت ہے
ناقدریِ ایام پر اتنا بھی بہت ہے

آیا نہ کبھی عقل میں دُنیا کا تماشہ
سمجھا بھی بہت ہے اسے دیکھا بھی بہت ہے

کہتے ہیں سرِ بزم وہ خوش ہو کے یہ بسملؔ
پڑھنا بھی بہت ہے ترا لکھنا بھی بہت ہے

نظر سے کہہ دو یہ کس کو رِجکٹ کرتی ہے　　کہ اچھی چیز کو دُنیا سِلکٹ کرتی ہے
کلام بسملِؔ رنگیں بیان پڑھو تو سہی　　وہ شاعری ہے جو دل پر ایفکٹ کرتی ہے

مری طرف سے اُنھیں ہر گھڑی کدورت ہے
جو ہے یہ حال تو مِلنے کی کون صورت ہے

گیا چھُڑانے کو روزہ پڑی نماز گلے
وہ کہہ رہے ہیں کہ چندے کی اب ضرورت ہے

---

[۱] منشی ایشور سرن صاحب سابق پریسیڈنٹ کایستھ پاٹھ شالہ - الہ آباد۔

بندہ نواز آپ تاسّف نہ کیجئے
مر جاؤں میں تڑپ کے مگر اُف نہ کیجئے
برتاؤ کیا ضرور ہیں مہمان کی طرح
بسمل کے واسطے یہ تکلّف نہ کیجئے

مرتے ہیں اور لوگ تو دولت کے واسطے
میں جان دے رہا ہوں محبّت کے واسطے
قسمت سے بات بن گئی شاہی بھی مل گئی
آیا تھا صرف کوئی تجارت کے واسطے
کہتے ہیں وہ کہ روز پہنتا نہیں ہوں میں
بنوا لیا ہے سُوٹ ضرورت کے واسطے
بسمل یہ پوچھتے ہیں فرشتوں سے قبر میں
دوزخ کے واسطے ہوں کہ جنّت کے واسطے

کیا بات کروں گردشِ ایام کے آگے
دفتر میں تو فرصت ہی نہیں کام کے آگے
بسمل اُنھیں تو تیرِ مراتب سے ہے انکار
لکھتے نہیں مسٹر بھی مرے نام کے آگے

یہ مانتا ہوں وطن سے تمھیں محبت ہے
مگر اسی کے صلے میں خیالِ شہرت ہے

ہم نے لڑتے ہوئے دُنیا میں اُنھیں دیکھا ہے
جن کو یہ بھی نہیں معلوم کہ دُنیا کیا ہے

کان اگر ہے تو سُنو یہ کسی فریادی سے
سانس لینا بھی ہے مشکل مجھے آزادی سے
ہم بھی شاگرد ہوئے دیکھ کے یہ اے بسمل
لیڈری آپ کیا کرتے ہیں اُستادی سے

جَو کی روٹی ہے پتّے کا ساگ ہے
یہ بھی مل جائے تو اچھا بھاگ ہے
اہلِ مرزاپور کیونکر خوش نہ ہوں
اُس طرف کاشی اِدھر پریاگ ہے
کیا سُنیں بسمل وطن والوں کی تان
اپنی ڈفلی اور اپنا راگ ہے

آج کل بدلا ہوا مضمون ہے
ہر قدم پر اک نیا قانون ہے
کیا لکھیں مضمون یہ مضمون ہے
نقطے نقطے کے لئے قانون ہے

جو آنر ملا ہے تو دل شاد ہے
کہ اب ہم کو سارا گزٹ یاد ہے

حیرت میں ہے کوئی تو کوئی پڑھ کے دنگ ہے
بسملؔ کی شاعری میں بھی اکبرؔ کا رنگ ہے

یہ بزمِ عیش میں کیا خوب کام چلتا ہے
کہ جام چلنے سے رندوں کا نام چلتا ہے
نہ دن سے ہے اِسے مطلب نہ رات سے مطلب
نفس کا سلسلہ ہر صبح و شام چلتا ہے
مخالفت کریں ہم اِن کی یہ مجال نہیں
قدم قدم پہ تو صاحب سے کام چلتا ہے
ادب کے ساتھ کہیں گیٹ پر نہ کیوں بسملؔ
بغیر حکم کب آگے غلام چلتا ہے

تجارت یا ہنر میں تو نہیں یورپ سے ہم آگے
مگر فیشن میں ہم رہتے ہیں اُس سے سَو قدم آگے
یہ کہہ کر رُک گئی قوم اپنی میدانِ ترقّی میں
چلو جھگڑا چکا بس بس نہ تم آگے نہ ہم آگے
مدارج میں ترقّی میں زمانے بھر سے پیچھے ہیں
لکھیں تو کیا لکھیں بسملؔ نہیں اُٹھتا قلم آگے

تہذیبِ مشرقی مسِ مغرب کے ساتھ ہے
بندر کی جست و خیز مداری کے ہاتھ ہے

یہ غلط ہے نیک و بد کا فیصلہ عقبا میں ہے
خُلد یا دوزخ مرے نزدیک اِسی دُنیا میں ہے

سر پہ جب سے سوار فیشن ہے
نہ وہ ہم ہیں نہ اگلی نیشن ہے
ہے ڈنر میں مزا کہ اے بسملؔ
آج میرا بھی انوِٹیشن ہے

جان آفت میں اور پڑتی ہے
زندگی مَوت سے جو لڑتی ہے
کس لئے سر اُٹھائیں اے بسملؔ
سر اُٹھانے میں مار پڑتی ہے

چمن میں ایک ایک غنچہ خوشی سے پھول جاتا ہے
مگر جب خاک میں مِلتا ہے سب کچھ بھول جاتا ہے
تعجب کیا جو بسملؔ یاد اُنھیں میری نہیں آتی
زمانہ کچھ دنوں کے بعد سب کو بھول جاتا ہے

بحرِ ہستی میں قضا کے گھاٹ اُترنا دیکھئے
مر رہا ہوں آئیے اب میرا مرنا دیکھئے
فلسفی کی عقل گُم ہے وہم بھی مجبور ہے
خاک کے ذرّوں کا مٹی میں سنورنا دیکھئے

بے کار یہ رونا ہے چندہ نہیں ملتا ہے
کیا اس کے سوا کوئی دھندہ نہیں ملتا ہے
مطلب کے جو بندے ہیں مطلب کے پجاری ہیں
دُنیا کو ملے ایسوں سے بندہ نہیں ملتا ہے
کب تک کوئی چندہ دے کب تک کوئی چندہ لے
چندہ نہیں آتا ہے چندہ نہیں ملتا ہے
کیا دیکھ سکے جلوہ محدود نظر بسملؔ
اللہ تو ملتا ہے بندہ نہیں ملتا ہے

یاس میں ہے کوئی تو آس میں ہے
زندگی سب کی فیلِ پاس[1] میں ہے
خلق میں ہر جگہ ہے دُکھ بسملؔ
سُکھ مجھے اپنے سُکھ نواس[1] میں ہے

پڑھ کر اب پوتھی برہمن کیا کرے
اُٹھ گیا ہے اس کا فیشن کیا کرے

اب پڑھے لکھوں کا یہ دستور ہے جو کہے بی بی اُنھیں منظور ہے

ہمیں ہو یا نہ ہو سامانِ عیش اُن کو مہیّا ہے
دروں میں خس کی ٹٹّی چھت میں بھی بجلی کا پنکھا ہے

---

[1] حضرت بسملؔ کے مکان کا نام ہے۔

بند اگر راہ ترقی ہو تو رونا چاہئے
آدمی کو کچھ نہ کچھ دُنیا میں ہونا چاہئے

اب ہے نہ میل جول نہ اُلفت کا رنگ ہے
آپس کی نوک جھونک ہے آپس کی جنگ ہے

مانا کہ زمانے سے ہمیں بیر نہیں ہے
لیکن کہیں جینے میں بھی تو خیر نہیں ہے
بسمل سے چھپاتے ہیں وہ کیوں رازِ محبّت
بندہ ہے اُنہیں کا یہ کوئی غیر نہیں ہے

یہ پنڈت اور واعظ تو ہمیں جینے نہیں دیتے
برانڈی ہے مقدّر میں مگر پینے نہیں دیتے

تمہارے واسطے ہر قسم کا سامان حاضر ہے
کہ دل حاضر ہے سر حاضر ہے میری جان حاضر ہے

جو خوشامد میں اپ ٹو ڈیٹ ہوئے آنریری مجسٹریٹ ہوئے

کب ہم نے یہ دی دھمکی تلوار نکالیں گے
جب کچھ نہ بن آئے گی اخبار نکالیں گے

آپ ہی پر منحصر کیا ہے یہ ہے سب کے لئے
کام کرتا ہے زمانہ اپنے مطلب کے لئے

پڑے ہیں فلسفے کے پھیر میں یہ ماجرا کیا ہے
سمجھ ہی میں نہ آیا آج تک ہم کو خدا کیا ہے

زندگی جب تک رہے چُپ چاپ چندہ دیجئے
اپنے ہاتھوں سے گلے میں اپنے پھندہ دیجئے

نہ پروا ہے محلّے کی نہ اپنے گھر سے مطلب ہے
کہے دُنیا بُرا لیکن ہمیں آنر سے مطلب ہے

نام لے لے کر بُتوں کا خوب بھوجن کیجئے
آئے ہو کاشی میں تو جی بھر کے درشن کیجئے

آدمی کو پالسی میں نیک ہونا چاہیئے
لیڈری کا امتحاں بھی ایک ہونا چاہیئے

سُنتا نہیں کوئی بھی تو کہنا فضول ہے
ایسی سبھا میں آپ کا رہنا فضول ہے
دریا کا رُخ جدھر ہو بہو اُس طرف ضرور
اُس کے خلاف زور میں بہنا فضول ہے
بسمل نئی روش پہ نئے رنگ ڈھنگ میں
جب کہہ سکو نہ خوب تو کہنا فضول ہے

کیا حال وطن کا ہے انھیں ہوش نہیں ہے
کرتے ہیں بہت بات مگر جوش نہیں ہے
اچھے کرو برتاؤ تو گُن گائے وہ بے شک
بسمؔل کوئی احسان فراموش نہیں ہے

کیا کیا نئے جہاں میں اُٹھے شر نئے نئے
پیدا ہوئے یہ جب سے ایڈیٹر نئے نئے

یہ اہلِ کعبہ اب کہتے ہیں مندر کے پُجاری سے
خدا محفوظ رکھے اونٹنی کی بھی سواری سے

یہ قہر یہ اندھیر زمانے میں کہیں ہے
جو ڈاگ کی عزت ہے وہ نیٹو کی نہیں ہے

مغربی سائنس کے ہوتے ہوئے سب ہیچ ہے
وہ زمانہ آ گیا تقلیدِ مذہب ہیچ ہے

پائنیر کا یہ عجب مضمون ہے
میں جو لکھ دوں بس وہی قانون ہے

سنگٹھن ہے تو کہیں تنظیم ہے کام اب لڑنے کا یوں تقسیم ہے

یہ کہانی وہ فسانہ ہیچ ہے　　　میری نظروں میں زمانہ ہیچ ہے
حضرتِ بسملؔ کوئی سنتا نہیں　　　آپ کا قومی ترانہ ہیچ ہے

مفہوم غضب ہے کبھی مضمون عجب ہے
کیا سمجھے کوئی آپ کا قانون عجب ہے

ایک بے کس یہ کہہ کے روتا ہے
کون دُنیا میں کس کا ہوتا ہے

عزیز وقت کے کھونے سے فائدہ کیا ہے
اُٹھو سحر ہوئی سونے سے فائدہ کیا ہے
ہنسی زمانے کو آئے جو حضرتِ بسملؔ
تو سب میں بیٹھ کے رونے سے فائدہ کیا ہے

جوشِ مذہب پر اکڑنا چاہیئے　　　آگ ہو تو کود پڑنا چاہیئے
بات یہ مجھ کو نہیں بسملؔ پسند　　　ہندو و مُسلم کو لڑنا چاہیئے

خراب دن کرے برباد رات کون کرے
وہ کہہ رہے ہیں کہ ایسوں سے بات کون کرے

اور اب کیا چاہیئے سرکار کے گُن گایئے
نل کا پانی پیجئے چکی کا آٹا کھایئے

نہ اِس کا ذائقہ اچھا نہ میل اچھا ہے
مرے خیال میں اب گھی سے تیل اچھا ہے

تہذیب کا لحاظ نہ بے سود کیجئے
کالج میں پڑھ چکے اب اُچھل کود کیجئے

پنڈت کو دیکھ لیجئے گنگا پہ ٹھاٹ سے
لیکن غرض نہیں اُنھیں پوجا سے پاٹ سے

کہاں وہ دل وہ کہاں اب دماغ باقی ہے
نہ تیل ہے نہ ہے بتّی چراغ باقی ہے

ہے یہی ظاہر نہیں ارمان نکلنے والے
سینکڑوں رنگ بدلتے ہیں بدلنے والے

نام نکلا ہے گزٹ میں کیا خوشی کا راج ہے
امتحاں میں پاس ہو جانے کی دعوت آج ہے

کَون کہتا ہے اِدھر ہر بار دیکھا کیجئے
مہرباں ہو کر کبھی سرکار دیکھا کیجئے
ہے جو یہ خواہش کلامِ حضرتِ بسملؔ پڑھیں
آپ بندے ماترم اخبار دیکھا کیجئے

پوچھتا ہوں سب سے جب کوئی ستم رانی کرے
مرثیہ خوانی کرے دل یا غزل خوانی کرے

خوشی کے ساتھ جئے ہم کہ پُر ملال جئے
بہت جئے تو سمجھ لو پچاس سال جئے

جنابِ پائنیرؔ کا آج یہ مضمون اچھا ہے
مرے سرکار کی بات اچھی ہے قانون اچھا ہے
نہ ہو جو ماننے کی کیونکر اُس کو مان لوں بسملؔ
وہ کہتے ہیں کہ دھوتی سے مرا پتلون اچھا ہے

یہ جانتا ہوں میں کہ خوشی غم کے ساتھ ہے
دُنیا کا سارا لُطف مگر دم کے ساتھ ہے

دکھانے کے لئے یوں چار جامہ اور کاٹھی ہے
مگر ہے بھینس اُسی کی بس کہ جس کے ہاتھ لاٹھی ہے

کہتے ہیں اُردو سے بھاشا خوب ہے کیوں نہ ہو مضموں ترا شاخوب ہے

مَیں ہوں فیشن ہے اور چندہ ہے بس اِسی کشمکش میں بندہ ہے
شاعری کے علاوہ اے بسملؔ اور بھی کوئی تیرا دھندہ ہے

ملتی جلتی دونوں شکلوں کا تماشا دیکھئے
مُدعا یہ ہے کہ اُردو اور بھاشا دیکھئے
اُن کو بسملؔ نے یہ کہہ کہہ کر مخاطب کرلیا
مَیں تڑپتا ہوں ذرا میرا تماشا دیکھئے

نتیجہ جینے کا یہ ہے کہ شاد کام جیے
جیے تو کیا جیے جب ہو کے ہم غلام جیے

آپ بھی کیا چیز ہیں کچھ قدر فیشن کیجئے
چھوڑئیے شوقِ بسنجر میل میں رن کیجئے

حضرتِ بسملؔ کہیں کیوں کر کہ ہم میں زور ہے
وہ لکھے ہر رنگ میں جس کے قلم میں زور ہے

دُنیا ہے اِس کے گرد غضب کا ہجوم ہے
کالج کی آج سارے زمانے میں دھوم ہے

زندگی پر جو ستم روز قضا کرتی ہے
فرض ہے اِس کے لئے فرض ادا کرتی ہے

انقلاباتِ جہاں سے کیا رہے کیا بن گئے
تھے کبھی راجہ مگر ہم آج پرجا بن گئے

دمِ آخر ہم اپنی زندگی کا راز کیا سمجھے
یہ کہہ کر چل دیئے دُنیا سے دُنیا سے خُدا سمجھے
خوش اس میں ہیں کہ بنگلے پر کیا شکوہ حریفوں کا
مگر اُن کو نہیں معلوم صاحب دل میں کیا سمجھے
نئے فیشن کے بندے ہیں نئے فیشن کے پُتلے ہیں
خدا کی شان تو دیکھو وہ صاحب کو خدا سمجھے
ہم اپنے دوستوں سے بات کیا کہتے بھلائی کی
ہمیشہ حضرتِ بسمل ہمیں وہ تو بُرا سمجھے

لطف اور اس کے علاوہ کیا ستم رانی میں ہے
اہلِ دُنیا غم میں ہیں دُنیا پریشانی میں ہے
حاکموں پر کیا ہو لیلیٰ کی سفارش کا اثر
قیس دیوانے کا کیس اس وقت دیوانی میں ہے
ڈاکٹر جھا نے کہی بسمل سے یہ کیا خوب بات
لیڈری کے واسطے دُنیا پریشانی میں ہے

یوں لکھ دیا ہے ایک طلب گار کے لئے
اپنا کلام وقف ہے اخبار کے لئے
مرنے کے بعد اور نہ اس کو ملے گا کچھ
دو گز زمیں ملے گی زمیں دار کے لئے
بھولے سے بھی نہ ذکر کرے وہ بہار کا
پابندیاں یہ مُرغِ گرفتار کے لئے
بسمل جو یہ نہیں تو نہیں خوبیِ کلام
کچھ سوز کچھ ہو درد بھی اشعار کے لئے

عمل کریں نہ کریں قصّۂ عمل تو ہے
کہ لیڈروں سے جہاں میں چہل پہل تو ہے

مغربی پھولوں کی اس میں بُو ہے اس میں باس ہے
باپ ہیں جاہل مگر بیٹا تو بی اے پاس ہے

بے محل یہ کیوں کہیں قیمہ ملے بوٹی ملے
ہم اسی میں خوش ہیں ہم کو پیٹ بھر روٹی ملے

فائدہ کچھ ہو تو بیشک ذکر ماضی کیجئے
حال کو اب دیکھئے کیوں فکر ماضی کیجئے

جس بات کی دُھن ہے اُنھیں اُس بات کی دُھن ہے
کالے میں نہیں گُن کوئی گورے ہی میں گُن ہے
بسمل سے پجاری نے کہی بات بہت خوب
جو پاپ ہے وہ پاپ ہے جو پُن ہے وہ پُن ہے

خوش کرنے کو میں کہہ دوں سو بار بہت اچھے
سرکار کا کیا کہنا سرکار بہت اچھے
اکبرؔ کی طرح چمکے بسملؔ بھی زمانے میں
غزلیں بہت اچھی ہیں اشعار بہت اچھے

ہم نے مانا ہر طرف اک دھوم ہے کیا خوشی دل کو ہے دل مغموم ہے
گلشن و ربار میں پھکے یہ کیا اُن کی نظروں میں تو دُنیا بُوم ہے
اِس تعلّی کا نتیجہ کچھ نہیں آپ جیسے ہیں ہمیں معلوم ہے
سچ کہا فیشن نہیں تو کچھ نہیں آج کل عالم میں اِس کی دھوم ہے
آپ کے برتاؤ اچھے ہیں بہت
حضرتِ بسمؔل کو یہ معلوم ہے

کوئی اِس کے ساتھ ہے اب کوئی اُس کے ساتھ ہے
دیکھنا یہ چاہیئے میدان کس کے ہاتھ ہے

تیری تو اور ریت میری اور ریت ہے
ایک ایک کی زباں پہ یہی بات چیت ہے
دل سے جو تم ملو تو ملیں کیوں نہ دل سے ہم
دُنیا کی ریت ہے یہ زمانے کی ریت ہے

ہمیں کچھ مرتبے دُنیا میں حاصل ہو نہیں سکتے
جو یک دل بن نہیں سکتے جو یک دل ہو نہیں سکتے
یہ اب شوہر سے کہتی ہے پڑھی لکھی ہوئی بی بی
مرے کمرے میں تم بے پوچھے داخل ہو نہیں سکتے
وہ یورپ کی ہواؤں سے رہیں گے دور اے بسمؔل
رُسِ لندن کے غمزوں سے جو بسمل ہو نہیں سکتے

اس طرف اپنی نگاہیں کیجئے
پھر یہ کہئے مجھ سے آہیں کیجئے
بن گئیں ہر سمت اگر سڑکیں تو کیا
سب کے دل میں اپنی راہیں کیجئے
حضرتِ بسمل کسی کا حکم ہے
رات دن چپ چاپ آئیں کیجئے

سوزِ غم سے کام چلنے دیجئے
جل رہا ہوں مجھ کو جلنے دیجئے
حضرتِ بسمل ہماری حلق پر
چلتی ہے تلوار چلنے دیجئے

پھرتے ہیں کیا سوچ کر وہ ہر طرف اکڑے ہوئے
مذہبی جھگڑوں میں جو دن رات ہیں جکڑے ہوئے
اُن سے ہم بنگلے پہ کہنے جا رہے تھے رازِ دل
راہ سے پلٹے مگر اپنی زباں پکڑے ہوئے
کچھ لکھیں بسمل تو آفت لکھ کے سر پر مول لیں
یہ ہیں قانونی شکنجوں میں بہت جکڑے ہوئے

جان لے یہ جان لے یہ جان لے
حسرت آخر ہے تو صاحب کا کہنا مان لے
مَیں اسیری میں بھی آزادی کا نغمہ گاؤں گا
اے مرے صیّاد تُو اچّھی طرح یہ جان لے
پانیئر کہتا ہے اے بسمل مناسب ہے یہی
لاٹ صاحب جو کہیں اُس بات کو تُو مان لے

جو کام ہو دُرست وہی کام کیجئے
مذہب کو آپ مُفت نہ بدنام کیجئے
ایسا نہ ہو کہ حضرتِ بسملؔ نہ ہوں شریک
دعوت جو کیجئے تو سرِ شام کیجئے

سارے جہاں سے اب ہیں وہ پیچھے پڑے ہوئے
جھنڈے کبھی تھے خلق میں جن کے گڑے ہوئے
تکلیف دو ذرا نگۂ التفات کو
بنگلے پہ ہم بھی ہاتھ ہیں جوڑے کھڑے ہوئے
وہ قول دے کے قول سے پھر جائیں کیا مجال
بسملؔ ہیں اپنی بات پر اب تک اڑے ہوئے

آپ میں کس بل نہیں بس بات کی بھرمار ہے
مُنتشر پبلکؔ ہے لیکن مطمئن سرکار ہے
وہ زمانہ اور تھا جب زندگی آسان تھی
یہ زمانہ اور ہے اب زندگی دشوار ہے

یہ سچ کہا جزا و سزا سب کے ساتھ ہے
دُنیا ہے سب کے ساتھ خدا سب کے ساتھ ہے
بسملؔ سے کہہ رہے ہیں وہ ذکرِ حیات پر
معلوم بھی تمھیں ہے قضا سب کے ساتھ ہے

منشی کنہیا لال

اِس کا وعدہ بھی عبث اقرار بھی بے سود ہے
آپ جب آجائیں سامانِ ڈنر موجود ہے
مجھ سے صاحب کی نظر ہی پھر گئی تو کیا رہا
زندگی بے کار ہے جینا مرا بے سود ہے
حضرتِ اکبرؔ تو اے بسملؔ یہاں سے چل بسے
اب الٰہ آباد میں مشہور صرف امرود ہے

اب کہاں عزت مہاشے جی کی سر کے سامنے
کون پوچھے ویدجی کو ڈاکٹر کے سامنے
دَور دَورہ بے طرح ہے مغربی تعلیم کا
ہیں تماشہ اب گروُ بھی ماسٹر کے سامنے
کُھل گیا اِس سے کہ تھے بسملؔ کبھی ہم بادشاہ
آج تک رکھّا ہوا ہے تخت گھر کے سامنے

وہ یہ کہہ کر ہنس رہے ہیں بس یہ ہونا چاہیئے
کوئی روئے یا نہ روئے تم کو رونا چاہیئے
جس کو راس آئے ہمیشہ مغربی آب و ہوا
ایسے گملے میں نہ تم کو بیج بونا چاہیئے
حضرتِ بسملؔ کہاں ہنستی ہوئی وہ صُحبتیں
بیٹھ کر چُپ چاپ اک کونے میں رونا چاہیئے

نوٹ۔ غلطی سے صفحہ ۲۷ پر سطر ۱۳ میں لفظ حُسن کے بجائے ”حشر“ چھپ گیا ہے

"کرشن کنج" الہ آباد میں لکھا گیا

کتنبہ نصیر الدین

باہتمام کالی۔کے مترا۔پرنٹر و پبلشر

انڈین پریس لمیٹڈ۔الہ آباد